ومن الناس من یشتری لھو الحدیث لیضل عن سبیل اللہ بغیر علم

قرآن حکیم

حقیقت خرافات میں کھو گئی
یہ اُمّت رَوایات میں کھو گئی

(اقبال)

مُطالعہ حدیث

تنقید صحیح کی رُوشنی میں

اور

بعض عقائد اسلامی کے مجہول و کمزور ماخذ

از

سیّد مقبول احمد صاحب بی۔ اے (مصنّف فلسفۂ مذہب)

مع

تنقید از مولٰنا حافظ اسلم صاحب جیراجپوری

ناشر

عباس منزل لائبریری ——— الہ آباد (۳)

اس مقام پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں برطانیہ کے مشہور فاضل لیڈورڈ ہارٹ پول لیکی کی مشہور کتاب ہسٹری آف یورپین مارس (مترجمہ جناب عبدالماجد دریابادی) کے بعض اقتباسات سے اپنے ناظرین کو روشناس کراؤں، جو مسیحی غالیان مذہب کے ساتھ ہمارے اجارہ داران فردوس پر بھی کچھ کم چسپاں نہیں ہوتے۔ فرماتے ہیں :۔

"جب ہمارے شارحین مذہب نے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر منقولات سے معقولات کو دبا دیا ہے۔ جب اُنھوں نے سینکڑوں ہزاروں سال کی پیہم کوششوں سے نفس بشری میں یہ اعتقاد راسخ جما دیا ہے کہ ایمان بالغیب تحقیق و عقل پرستی سے افضل ہے، تو ایسی حالت میں لازمی ہے کہ ہم جبلتہً عقلی دیانتداری کی طرف سے آنکھیں بند کرلیں، اور کورانہ تقلید کے ڈھرّے لگ لیں۔ (صفحہ ۹) لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ سیاسی و فلسفیانہ راستبازی کے نشو و نما کا راستہ بالکل صاف رہا ہے کیونکہ واقعہ یہ ہے کہ علماء مذہب قدم قدم پر اس کی مخالفت بیجا کرتے رہے اور صدیوں تک اُن کا یہ شیوہ رہا کیا ہے کہ جہاں کوئی تصنیف اُن کے عقائد کے خلاف نکلی بس اس کو ممنوع الاشاعت قرار دیا اور جب پھر اتنا اقتدار باقی نہ رہا تو یہ کوشش ہر صورت جاری رکھی کہ آزاد خیالی و روشن خیالی کو معصیت قرار دیتے رہے (صفحہ ۱۰۸)

اس سوال کا جواب، کہ قدماء نے قربانی کے اسرافی پہلو کے خلاف کیوں آواز نہ اُٹھائی اور اس زمانے کے اکثر اہل علم کیوں خاموش ہیں، بھی "لیکی" کے الفاظ میں سنئے :۔

"قدیم حکماء اپنی آزاد خیالیوں کو پرائیویٹ صحبتوں یا اپنی ان تصانیف تک، جو صرف ایک مخصوص حلقہ میں اشاعت پذیر ہوتی تھیں، محدود رکھتے تھے۔ اور بلحاظ عمل مذاہب مروجہ کی مہمل سے مہمل رسوم تک کی پابندی کرتے تھے اور عوام کے سامنے ان کی تائید کرتے تھے۔" (صفحہ ۱۲۵)

"حارد علانیہ کہتا تھا کہ بہت سے مذہبی حقائق ایسے ہیں جن سے عوام کا لاعلم رہنا ہی بہتر ہے۔ وہ [illegible] اکاذیب ہیں جن پر عوام کا اعتقاد رکھنا ہی قرین مصلحت ہے۔ (۔۔۔)

ایک مسیحی معجزہ کا ذکر کرتا ہے :۔

"ایک شب کو مسیح نے کھانا کھانے وقت اپنے جسم کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اُسے ریزہ ریزہ کرکے اپنے [illegible] میں تقسیم کردیا جنھوں نے اُسے کھالیا۔ پھر یہ سب کچھ ہوتا رہا اور مسیح جوں کے توں قائم رہے۔ کون ہے جو اس واقعہ کو [illegible] قطعاً مستبعد و محال نہ قرار دیگا؟ لیکن باینہمہ کروڑوں ذی ہوش مسیحیوں نے اسے بے چون و چرا تسلیم کرلیا ہے اب بھی تسلیم کررہے ہیں۔ اسکا باعث سوائے اسکے اور کیا ہوسکتا ہے کہ اعتقاد قوائے فطرت کی زبان بند کردیتا ہے۔" (صفحہ ۔۔۔)

اس تقلید وہم کے باوجود مقام مسرت ہے کہ اس غیر قرآنی رسم کی مخالفت کا جرم صرف امت علماء اکابر پر عاید نہیں ہوتا۔

این گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند

عصر حاضر کے متعدد فضلاء و مشاہیر نے اسکے خلاف جرأت سے قلم اُٹھایا اور اُنکے اتباع و تلامذہ نے علاوہ اس سے

Marfat.com

اظہار برأت کیا۔ ہندستان کے مصلح اعظم سرسید احمد خاں کی تحقیق سنئے :۔

"حج میں قربانی کی کوئی مذہبی اصل قرآن مجید سے نہیں پائی جاتی۔ مگر ایک بیابان غیر ذی زرع تھا۔ اسقدر لوگوں کے جمع ہونے سے خوراک کا میسر آنا مشکل تھا اسلئے اکثر لوگ خوراک کے لئے جانور اپنے ساتھ لے جاتے تھے جو بُدن اور قلائد کے نام سے مشہور تھے اور جو نہ لے جاتے تھے وہ مکہ میں خریدتے تھے۔ اُن کو ذبح کر کے خود بھی کھاتے تھے اور لوگوں کو بھی کھلاتے تھے۔ حج میں صرف یہی اصل قربانی کی قرآن مجید سے پائی جاتی ہے ..... وہاں پر نہ کوئی دیوتا ہے نہ دیبی ہے نہ پہاڑ پر کوئی چیز ہے جس پر بکرا یا مینڈھا یا اونٹ چڑھایا جاوے نہ خدا کو اُس کی بو خوش آتی ہے نہ اُن کا خون پیتا ہے، نہ اُنکی جان لینے سے خوش ہوتا ہے بلکہ وہ تو صرف نیکی اور بھلائی چاہتا ہے۔ جیسے کہ خود اُس نے کہا لن ینال اللہ لحومھا ولا دماءھا ولکن یناله التقوی منکم پس اس زمانہ میں جو حج کے دنوں میں حاجت سے زیادہ قربانی کی رسم ہے اور لاکھوں جانور ذبح کر کے جنگل میں ڈالتے ہیں جنکو گیدڑ کوّے بھی نہیں کھاتے اس کا کچھ بھی نشان مذہب اسلام میں نہیں ہے۔" (تفسیر القرآن سرسید احمد خاں جلد ۱ صـ۲۱۲)

لاہوری احمدی جماعت کے قائد خواجہ کمال الدین مرحوم لکھتے ہیں :۔

"اسوقت توکل کی کل قومیں کفارہ پرست ہوگئیں۔ اور ہمارا بھی یہی حال ہوگیا۔ عمل وہ مصیبت افزا چیز ہے کہ جسکی سہل آجکل کی دنیا نہیں ہوسکتی۔ سب کے سب اسی فکر میں ہیں کہ کسی کا کفارہ یا کسی کی سفارش ہمیں اس بوجھ سے آزاد کردے چنانچہ مسلمانوں نے بھی اپنے صدقات اور قربانیوں کو جن کی غرض وغایت کچھ اور تھی۔ کفارہ کے رنگ میں ہی تسلیم کرلیا۔ عیسائی بھی ہمیں یہی کہتے ہیں کہ تم جو عید الضحیٰ کے موقعہ پر لاکھوں جانیں قربان کر دیتے ہو اور تم سے بھی پہلے ہر مذہب و ملت والے ایسی ہی قربانیاں کیا کرتے تھے اور قربانیوں کے ذریعہ ہی خدا کی آتش غضب فرو ہوا کرتی تھی۔ لہذا ان ہی قربانیوں کے قائم مقام خدا کا بیٹا خدا کے مذبح پر آچڑھا۔ یہ وہ ذبح عظیم ہے کہ جس نے سب چھوٹی موٹی قربانیوں کا عوض دیدیا ہے۔ اگر عید کے ذبح شدہ جانوروں پر چڑھ کر مسلمانوں کے لئے پلصراط پر سے گزرنا آسان ہوسکتا ہے تو خدا کا بیٹا بھی اپنے بھیڑوں کو اپنے کندھوں پر چڑھا کر پار اُتار سکتا ہے۔ لہذا نتیجتہً ان دونوں کفاروں میں کیا فرق ہے۔ اسکے علاوہ سینکڑوں پیر فقیر اگر ہمارے وسیلہ اور شفیع ہوسکتے ہیں تو مسیح کیوں شفیع ومنجی نہیں ہوسکتا؟ اگر فی الواقع یہی اسلام ہے تو پھر اسلام اور دیگر کفارہ یا شفاعت کے مذاہب میں کون سا فرق ہے۔ اختلاف شخصیت یا اختلاف اسمی سے تو حقائق میں اختلاف پیدا نہیں ہوسکتا۔ بات یہ ہے کہ جو مذہب قصہ کہانی پر آ ٹھہرا اور آج ہماری بھی یہی حالت ہے تو اسکا حشر یہی ہوگا۔ (رسالہ اشاعت اسلام ماہ اپریل ۱۹۲۷ء صـ۱۵۱)

ہندستانی صوفیوں کی ایک جماعت کے مشہور پیشوا خواجہ حسن نظامی نے لکھا ہے :۔

"جب سے قرآن مجید کے ارشاد کو پڑھ کر سمجھا ہے کہ خدا کو خون اور گوشت درکار نہیں بلکہ وہ پرہیزگاری طلب کرتا ہے

Marfat.com

سے میں نے خون بہانا چھوڑ دیا۔" (حسن نظامی روزنامچہ ۸ اپریل ۱۹۳۳ء)

تحریک خاکساران کے فاضل بانی جناب مشرقی کے تاثرات دیکھئے :۔

"قرآن حکیم نے مسلمان کو واضح طور پر حکم دیا تھا کہ" اے مسلمانو! اپنے دشمن کے بالمقابل جہاں تک تمہاری طاقت کی حد ہے قوت کے سامان تیار رکھو، بالخصوص گھوڑوں کی چھاؤنیاں تاکہ تم ان چھاؤنیوں سے خدا کے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو خوفزدہ کر سکو۔" انہی گھوڑوں کی چھاؤنیوں کی اہمیت کو مسلمان کے دل میں ذہن نشین کرنے کے لئے خدائے عزوجل نے قرآن حکیم میں گھوڑوں اور اُن کے قدموں کی ٹاپوں کی قسمیں کھائی ہیں! دلدلے ہوئے فوجی گھوڑوں کا شد و مد سے ذکر کیا ہے۔ ہزارہا مسلمان ہر علاقے میں آج اس گئے گذرے زمانے میں بھی ہر سال قربانی کے دُنبوں اور بکروں کی پرورش اس محبت سے کرتے ہیں کہ بعض اوقات عقل اس غلو فی الدّین پر دنگ رہ جاتی ہے۔ ان دُنبوں کو روز نہلاتے ہیں۔ ان کی مالشیں کرتے ہیں۔ ان کو زیور پہناتے ہیں، ان کے اوڑھنے اور دوشالے تیار کرتے ہیں۔ ان پر رنگ دار بیل بوٹے بناتے ہیں، قرآن حکیم میں ان دُنبوں کو اس طرح موٹا کرنے کا کہیں ذکر نہیں، نہ خدا کو ضرورت تھی کہ قربانی کے بکرے کے لئے جو چند منٹ میں جان دے کر بیکار ہو جاتا ہے، اس قدر اہتمام کرنے کی ضرورت سمجھتا۔ اس نے تو صاف طور پر قرآن حکیم میں کہدیا تھا کہ" مجھے تمہارے بکروں کے خون اور گوشت نہیں پہنچتے، اگر کچھ پہنچتا ہے تو تمہارا تقویٰ اور قانون خدا کا خوف پہنچتا ہے۔" لیکن ہمارے نفس پرست مولوی اور عالم دین کو چربی دار اور تر گوشت کی ضرورت ہر وقت تھی، وہ اپنے آپ کو اور اپنی ذرّیت کو پشتوں تک تر نوالے دینا چاہتا تھا۔ اُس نے سمجھا کہ جب تک قربانی کے دُنبوں کو قیامت کے دن کے "پلصراط کے گھوڑے" بنا کر جنّت کے سبزہ باغ نہ دکھائے جائینگے اُمت کے پٹھے کبھی موٹے نہ ہو سکیں گے۔ الغرض "پلصراط" کی روایت پیدا کر دی گئی۔ فوجی گھوڑے اور چھاؤنیاں ہوں نہ ہوں کی نہ تھیں۔ وہ اگر قرآن کی مذکورہ بالا آیت کو ظاہر کرتا تو اپنے لئے ہمیشہ کی مصیبت مول لیتا۔ اُسے ہمیشہ کے لئے سپاہی بننا پڑتا۔ اُس نے قرآن کے حکم کو اپنے نفس کے آرام کے لئے زہر ہلاہل سے بدتر سمجھ کر پاؤں سے ٹھکرا دیا اور فدائے عظیم کے عظیم الشان حکم کو پکا کے برابر وقعت نہ دیکر "حدیث شریف" کی شان اس قدر بلند کر دی کہ تیرہ سو پچاس برس کے بعد بھی اُمت کے دبنے خوب موٹے ہیں اور امت کے گھوڑے بھوکے مر رہا ہیں ہو چکے ہیں۔ (الاصلاح ۴ ستمبر ۱۹۳۶ء)

میں نے اس مضمون میں گزشتہ و موجودہ اکابر و علماء کے کثرت تائیدی فقرے نقل کئے ہیں۔ لیکن واضح رہے کہ یہ لوگ میرے لئے یا کسی مسلم قرآن کے لئے سند و حجت کا درجہ نہیں رکھتے، شخص پرستوں کی تسلی کے لئے اشخاص و رجال کیطرف رجوع کرنا پڑتا ہے، جس طرح دوائیں انسان کا جزو غذا نہیں ہوتیں۔ لیکن مریضوں کے لئے انکی ضرورت پڑتی ہے روح کی اصلی غذا صرف کلام الٰہی ہے۔ قرآن مجید کی نص صریح کے خلاف ہزاروں امام، لاکھوں مجدّد،

کروڑوں مفسر پکاہ کی حیثیت نہیں رکھتے۔ پس جو صاحب اس مضمون کے خلاف قلم اُٹھائیں وہ صرف قرآن اور علوم
کو پیش کریں، جس پر غور کرنا راقم کا فرض ہوگا۔ کسی شخص کا قول محض اس شخص کی حیثیت سے قابل قبول یا درخور
نہیں سمجھا جائے گا۔

خلاصہ و مقصود

قربانی قدیم رسم ہے، قریباً تمام اقوام عالم کا معمول رہی ہے، لوگوں کی جہالت کی وجہ سے قربانی بجائے مفید
ہونے کے سخت مضر ہوگئی، قرآن نے اس کی اصلاح کرکے اس کو مفید اور معقول بنایا اس حد تک ہم اس کے قائل
ہیں، بلکہ ضرورت شرعی کے وقت جیوان کیا انسانی جان کی قربانی بھی فرض ہوجاتی ہے، قرآنی اصلاح کے بعد مسلمان
جلدی ہی قدیم اسراف و توہم کی طرف جھک پڑے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس غریب قوم کا کروڑوں روپیہ ہر سال برباد
ہوتا ہے جس سے تمام کائنات اسلامی خصوصاً حجاز کی تعلیمی، معاشری اور سیاسی حالت سدھر سکتی ہے ہسپتال اور اسکول
بنائے جاسکتے ہیں۔ غربا کی امداد کے لئے کارخانے قائم کئے جاسکتے ہیں۔ مفید لٹریچر کی اشاعت ہوسکتی ہے۔ اسلحہ فراہم
ہوسکتے ہیں۔ ریلیں، نہریں، سڑکیں اور مسافر خانے تیار ہوسکتے ہیں۔ مروجہ قربانی، حج کے بعض موجودہ غیر قرآنی مراسم کو صحیح
تسلیم کرلینے کے بعد بھی خود عاملین قربانی کے نزدیک ارکان حج میں داخل نہیں۔ ہاں حسب ضرورت جانوروں کی
قربانی صرف مکہ معظمہ میں ہونی چاہیئے۔ دوسرے بلاد و امصار میں اس کی قطعاً ضرورت نہیں مکہ میں بھی چاروں امام
اور عام علما کے ارشاد کے مطابق ایسا شخص مختار ہے چاہے روزہ رکھے چاہے صدقہ دے نصف صاع، چاہے
بکری ذبح کرکے فقرا کو بانٹ دے۔ غرضکہ ان تینوں کام میں سے جو کریگا وہ کافی ہوگا۔ قرآن پاک میں اس جگہ
سے سہل لفظ بولے گئے ہیں، فدیہ طعام ہو یا صدقہ یا نسک۔

(تفسیر نواب صدیق حسن صاحب جلد ۲ ص۲۵۵)

یہ مضمون کثرت اشغال کے باعث متفرق اوقات میں تھوڑا تھوڑا لکھا گیا، اس لئے اسکی ترتیب میں خامیوں
کا رہ جانا اغلب ہے۔ بعض مباحث کو ماخذوں کے نہ ملنے کے سبب اور بعض کو طوالت کے خوف سے تشنہ چھوڑنا
تاہم مجھے یقین ہے کہ یہ کوشش مخلص محققین کے لئے اس حالت میں بھی فوائد سے خالی نہیں۔

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم

ما ارید الا الاصلاح ما استطعت ط وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم ط

Marfat.com

تتمہ بر مضمون قربانی حضرت عرشی

از:— مؤلف

"نسک کی جمع مناسک ہے اور مناسک کے معنی اعمال حج ہیں (دیکھو ترجمہ قرآن مولانا اشرف علی) اعمال حج میں ایک چیز جانوروں کا ذبح کیا جانا بھی ہے۔ اس لئے نسک کے معنی جانوروں کا ذبح کیا جانا بھی ہو سکتا ہے یعنی جو جانور مکہ میں یا نہ حج میں لائے جاتے تھے۔ یہ جانور جو حاجی لوگ باہر سے لاتے تھے۔ ان کو بدن کہتے ہیں۔ قرآن نے ان بدن کو شعائر اللہ کہا ہے یعنی وہ خدا کے نام پر وقف ہوتے تھے۔ اس لئے راستے میں ان کا غارت حرام ٹھہرا۔ بدن کی تمیز کے لئے ان پر جھول ڈال دی جاتی تھی۔ یا گلے میں پٹہ ڈال دیا جاتا تھا۔ مکہ میں یہ جانور اسلئے لاکر ذبح کئے جاتے تھے کہ ایام حج میں خوراک کی کمی نہ ہونے پائے جس سے اہل مکہ اور باہر کے آنے والوں کو تکلیف ہو۔ ان ذبیحہ کے علاوہ دوسری طرف سے جانوروں کا شکار کرنا حرم میں حرام تھا۔ اور تاکہ لوگ ان جانوروں کی خرید و فروخت نہ کریں۔ ان کا ذبح کیا جانا بعض مناسک حج کا فدیہ قرار پایا۔ ظاہر ہے کہ خوراک کی بہم رسانی اسی طرح ممکن تھی کہ باہر سے جانور لائے جاویں جو خدا کے نام پر وقف ہوں اور ایام حج میں ذبح ہوں۔

یہ کہنا نادانی ہے کہ حج اسلام میں ایک وقت معین پر فرض کیا گیا تھا۔ حج کی رسم حضرت ابراہیم کے وقت سے چلی آتی تھی چنانچہ قرآن میں بھی اسکا اظہار ہے۔ یوں کہنا چاہیئے کہ رسم حج اسلام میں بھی باقی رکھی گئی۔

جانوروں کا بے ضرورت مکہ میں ذبح کرنا نہ واجب ہے نہ مسنون اور نہ یہ کوئی نیکی ہے۔ نیکی کی تعریف قرآن نے لیس البرّان تولّوا وجوھکم میں کردی ہے۔ اس لئے تمام ایسی حدیثیں جن میں نفس قربانی یا ذبیحہ کرنے کی اور کار بنایا گیا ہے وہ میرے نزدیک موضوع اور باطل ہیں۔ مثلاً یہی جانوروں کے خون بہلنے اور خدا کے اس سے ہونے اور اس پر انعام دینے کا کوئی تعلق کم از کم اسلام سے نہیں ہو سکتا۔ دوسری امتیں جو اس خیال سے کرتی تھیں ان کے فلسفہ اور تاریخ پر میں فلسفہ مذہب میں کافی لکھ چکا ہوں۔ اگر جانوروں کے ذبح کرنے پر خوشی ہوتی ہے تو پھر ہر بوچڑ ولی اللہ ہو جائے گا۔ بقرعید کے دنوں میں جانور ذبح کئے جانا تو یہ اپنا شوق ہے۔ منع نہیں کرتا بلکہ گوشت کا ایک حصہ خیرات کر دیا جائے اور بھوکوں کو کھلا دیا جائے تو اس کا ثواب بھی ہے۔ مگر ہندستان سے باہر بھی مسلمان مہذب ملکوں میں رہتے ہیں جہاں ہر شخص کو اپنے گھر کو بوچڑ خانہ بنانے کی حکومت کبھی نہ صحت اجازت نہیں دے سکتی۔ تو کیا تمام دنیا کے مسلمان ہندستان میں اکٹھے ہو جائیں یا عرب چلے جائیں۔ جانوروں کا خون دل کھول کر بہائیں۔

یہ کہنا کہ رسول اللہ نے مدینہ میں بقرعید منائی ہے اور قربانی کی ہے تو اگر اس روایت کو مان لیا جائے تو اس کا ہونا کہاں سے ٹھہرا۔ رسولؐ کا ہر فعل مسلمان کے لئے واجب نہیں ہو سکتا۔ ان کی بہت سی قومی رسمیں تھیں جو

عرب ہونے کی حیثیت سے وہ کرتے تھے۔ مثلاً عقیقہ عرب کی رسم تھی اور ممکن ہے کہ رسول اللہ نے بھی کیا ہو مگر وہ نہ ہمارے لئے واجب ہے نہ سنت۔ کرے یا نہ کرے۔

قابیل کی قربانی میں یہ کہاں ذکر ہے کہ اُنھوں نے بکرا ذبح کیا تھا۔ قربانی کے لفظی معنی تو تقرب حاصل کرنے کے ہیں۔ قاعدہ ہے کہ جب کسی بڑے آدمی سے تقرب حاصل کرنا ہوتا ہے۔ تو لوگ کچھ اس کے لئے نذر یا تحفہ لیجاتے ہیں خدا کو تحفہ یا نذر لے جانا اور اس کی قربت حاصل کرنا وہ ہمارے نیک کام ہیں۔ یہ ہی چیزیں خدا کو پہنچتی ہیں اور یہ تقرب کا ذریعہ ہے۔ جانوروں کا گوشت وخون اس کو نہیں پہنچتا۔

"فصل لربك وانحر" پر مولانا مودودی نے نہیں لکھا۔ مگر دوسرے علماء نے اس آیت سے بھی استدلال کیا ہے۔ ان سے اگر قربانی مراد ہے تو بھی اس کو فرض ہونا چاہیئے کہ قرآن کا صاف و صریح حکم ہے۔ پھر آپ قربانی کو واجب کہتے ہیں۔ کیوں واقعہ یہ ہے کہ اونٹ کا ذبح کرنا نحر بولا جاتا ہے۔ بنی اسرائیل میں اونٹ حرام تھا۔ حضرت موسیٰ سے پوچھتے کہ حرام ہے یا حلال کیونکہ عرب اس کو کھاتے تھے ان کے اس تردد کو اس آیت میں دور کر دیا گیا اور اونٹ حلال کیا گیا۔ الکوثر کے معنی میں مفسرین کو بہت اختلاف ہے۔ ابن عباس نے اس کے معنی خیراً کثیراً کے لئے ہیں۔ کسی نے اسکو بہشت کی نہر کہا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ لفظ عبرانی ہے اور اس کے معنی "پاک گوشت" کے ہیں۔

مہدی آخر الزماں

(ڈاکٹر یعقوب بیگ صاحب سول سرجن رحیم یار خاں)

امام مہدی کا ذکر قرآن میں نہیں ہے۔ اور پہلی صدی ہجری میں اس عقیدہ کی موجودگی کا ثبوت تاریخ اسلام میں نہیں سنیوں کی معتبر کتبِ احادیث موطا امام مالکؒ میں (جو پہلی صدی ہجری میں لکھی گئی) اور بخاری و مسلم میں بھی امام مہدی نہیں ہے۔ البتہ سنیوں کی دوسری کتب احادیث میں بہ اختلاف کثیر متعدد احادیث امام مہدی سے متعلق پائی جاتی یہ اختلاف امام مہدی کی قوم، وقت آمد، حلیہ اور جائے نزول وغیرہ میں ہیں۔ عقیدۂ خلافت و امامت سنیوں کے مذہب میں شمار کیا گیا ہے۔ لیکن وہ مہدی کے منتظر ہیں۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ پہلی صدی ہجری میں خلفاء بنو اُمیہ کی خلافت تھی۔ اور بنو اُمیہ سے کسی نے بھی دعوائے مہدویت نہیں کیا۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ عقیدہ اس وقت تک مسلمانوں میں رائج نہ تھا شیعوں کے ہاں مسئلہ امامت اصول دین سے ہے۔ روایات ائمہ سے کہ تمام ائمہ منصوص یعنی خدا اور رسول کے نامزد کردہ ہیں اور قرآن میں سب ائمہ کے نام تھے[1] جو مخالفین نے

[1] شیعوں کے سب فرقے اس پر متفق نہیں ہیں۔

Marfat.com

اُن کا عقیدہ ہے کہ "اصل قرآن" ائمہ کے پاس تھا اور ایک امام سے دوسرے امام کے پیچھے منتقل ہوتا رہا، مگر تعجب ہے کہ بایں ہمہ شیعوں کے دونوں بڑے فرقوں، امامیہ و اسمٰعیلیہ میں ائمہ کے متعلق اختلاف کثیر ہے۔ امامیہ یعنی اثنا عشری بارہ اماموں کو مانتے ہیں۔ حضرت علیؓ پہلے امام ہیں اور امام محمد بن عسکری (مہدی) بارھویں۔ شیعہ اسمٰعیلیہ ان میں سے صرف پہلے چھ ائمہ کو جائز امام مانتے ہیں اور ساتویں امام (موسیٰ کاظمؓ) اور ان کے جانشینوں کو امام نہیں مانتے۔ اُن کا عقیدہ یہ ہے کہ چھٹے امام (جعفر صادقؓ) نے اپنے بڑے بیٹے امام اسمٰعیل کی نصِ امامت بیان کی۔ اس لئے وہ جائز امام ہیں۔ وہ بعد میں امام جعفر صادقؓ کے اس نص کو بدلنے کے فعل کو جائز نہیں مانتے۔ امام اسمٰعیلؓ کے بعد اس فرقہ کے علیحدہ امام ہیں۔ مثلاً امام محمد المکتوم۔ امام جعفر المصدق مکتوم اور امام محمد الحبیب مکتوم اور امام عبداللہ المہدی وغیرہ۔ دونوں شیعہ فرقوں کا عقیدہ ہے کہ کوئی زمانہ بلا امام کے نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اسمٰعیلیہ اور اُن کے مختلف فرقوں میں امام اسمٰعیلؓ کے بعد ہر زمانہ میں موجودہ امام تسلیم کئے گئے ہیں۔ شیعہ امامیہ کا عقیدہ یہ ہے کہ گیارھویں امام (حسن عسکریؓ) کی وفات کے بعد جو ۲۶۰ھ میں ہوئی اُن کے فرزند امام محمدؒ جن کی عمر اُس وقت چار سال کی تھی، بارھویں امام ہوئے۔ وہ ایک غار (سرمن رائے) میں جو سامرہ کے پاس تھا، چلے گئے اور پھر نظر نہ آئے۔ اس غیبت کے پہلے ۶۸ سالوں کو غیبتِ صغریٰ کہتے ہیں۔ چونکہ اس عرصہ میں چار بزرگوں کی معرفت جو باب کہلاتے تھے امام اپنے متبعین سے خط و کتابت یعنی سفارت رکھتے تھے، لیکن اس کے بعد یہ سلسلہ منقطع ہو گیا اور امام آج تک غیبتِ کبریٰ میں ہیں۔ وہ قربِ قیامت میں تشریف لا کر دنیا کو عدل و انصاف سے بھر دیں گے اور زمانہ غیبت امام کے نیک و بد لوگوں کو زندہ کر دیں گے (عقیدہ رجعت) اور جزا و سزا پائیں گے۔ وہ بارھویں امام (محمد بن عسکری) کی آمد کے منتظر ہیں۔ اس لئے امام کا نام امام منتظر، امام قائم، امام غائب یا امام مہدی یا آخر الزمان ہے۔ سنیوں اور شیعہ کے مذکورہ انتظار کے باوجود تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عقیدہ دوسری صدی ہجری میں جب کہ بنو امیہ کا ایوان خلافت متزلزل ہو گیا تھا۔ پیدا ہوا اور مہدی کے متعلق جس قدر احادیث سنیوں اور شیعوں کے ہاں پائی جاتی ہیں، غالباً خلافت و امامت کے مختلف امیدواروں کے متبعین نے اپنے اپنے دعوے کی تائید میں وضع کیں اور یہ بات مضامینِ احادیث کے اختلاف سے بھی عیاں ہے جس سے متعلق ابتدا میں اشارہ ہو چکا ہے۔ احادیث مہدی مختلف امیدواروں کے حالات پر ہُو بہُو منطبق ہیں۔ حُلیہ تک ملتا ہے۔ البتہ شیعہ کا خیال کہ تمام ائمہ منصوص من اللہ نامزد تھے اور خدا و رسولؐ نے قرآن اور احادیث میں اُن کی خبر دی تھی بظاہر یہ ظاہر کرتا ہے کہ ابتدائے اسلام سے ائمہ اور مہدی کا یہ عقیدہ موجود تھا اور ائمہ کی حدیث اس دعویٰ کی موید ہیں اس لئے ضروری ہے کہ اس پر کچھ روشنی ڈالی جائے۔ اس ضمن میں پہلی بات جو قابلِ غور ہے، وہ یہ ہے کہ اس عقیدہ کا انحصار قرآن میں ائمہ کے نام موجود ہونے پر ہے۔ جبتک "اصل[1] قرآن" جو ائمہ کے پاس تھا، موجود نہ ہو دعویٰ ثابت نہیں ہو سکتا۔ اور روایات جو اس دعویٰ کی موید ہیں چونکہ

[1] اگر اصل قرآن دنیا میں غائب رہنے کے لئے ہی آیا تھا، تو مقصود اس کی فرت اور بہت سی آیات جو صفات قرآن میں ہیں باطل ٹھہرتی ہیں (مؤلف)

Marfat.com

خود اُن کا اپنا وجود دوسری صدی ہجری سے پہلے ثابت نہیں ہے، اسلئے وہ کافی متصور نہیں ہوسکتیں۔ دوسری بات غور طلب ہے کہ شیعہ کے ہاں مسئلہ امامت اصول دین سے ہے اور ایسے اہم مسئلہ کے لئے روایات یقیناً کافی نہیں ہوسکتیں۔ بنو امیہ کے زوال کے بعد دوسروں کی طرح بنو فاطمہ بھی مدعی خلافت و امامت تھے۔ گمان غالب ہے کہ اُن کے متبعین نے بھی اُنکی تائید میں احادیث و روایات وضع کرلی ہوں۔ اسکے علاوہ دو اُمور بالخصوص قابل غور ہیں۔

(۱) **تعیّن امام**۔ اس میں بنو ہاشم بلکہ بنو فاطمہ میں قدم قدم پر اختلاف ہے، جو صریح نص قرآنی اور نامزدگی کی موجودگی میں نہیں ہوسکتا تھا۔ مثلاً تیسرے امام (حسینؓ) کی شہادت کے بعد حضرت علیؓ کے فرزند محمد بن حنفیہؒ نے چوتھے امام (زین العابدینؒ) کے بالمقابل امامت کا دعویٰ کیا۔ تصفیہ استحقاق سنگِ اسود کے سپرد کیا گیا، مگر سنگِ اسود کے فیصلہ کو دونوں فریق نے اپنی اپنی تائید میں شمار کیا۔ نزاع طے نہ ہونے پر محمد بن حنفیہؒ بنو اُمیہ سے جاملے اور یزید کی بیعت کی۔ پھر چوتھے امام کے بعد اس کے پسر پانچویں امام (باقرؒ) کو اُن کے بھائی امام زیدؒ نے تسلیم نہ کیا اور علیحدہ امامت و جماعت (زیدیہ) قائم کی۔ جو خلفائے اربعہؓ کو جائز خلیفہ اور امام مانتے ہیں اور امام زیدؒ نے دعویٰ مہدویت بھی کیا، جس کا ذکر آئے گا۔ پھر چھٹے امام (جعفر صادقؒ) نے اپنی جانشینی کی نص کا اعلان پہلے بحق امام اسمٰعیلؒ اور پھر بحق امام موسیٰ کاظم کیا۔ اور اس تبدیلیٔ نص پر رفع اعتراض کے لئے خداوند جل شانہٗ کو بداء[1] کا واقع ہونا اور امام اسمٰعیلؒ کے نقضِ عصمت کو دلیل میں پیش کیا، جیسا کہ روایاتِ امامیہ سے پایا جاتا ہے۔ اسمٰعیلیہ اس دلیل کو تسلیم نہیں کرتے اور وہ اپنے اماموں کے نصِ صریح کے مدعی ہیں اور پھر بنو عباسؓ نے خلافت و امامت خلفاء اربعہ کو تسلیم کیا اور بمقابلہ بنو فاطمہ و بنو امیہ اپنے خلافت و امامت کے مدعی ہوئے اور اپنے دعویٰ کو احادیث و دلائل سے ثابت کیا۔ اُنھوں نے ۱۳۲ھ سے ۶۵۹ھ تک بغداد میں اور ۶۵۹ھ سے گیارھویں صدی تک مصر میں خلافت و امامت کی۔

(۲) **دعویٰ مہدویت**۔ بنو ہاشم اور بنو فاطمہ میں سے متعدد بزرگوں نے دوسروں کی طرح پے در پے دعویٰ مہدویت کیا اور مثلاً چوتھے امام کے فرزند امام زیدؒ نے جو حسینی تھے، سنہ ۱۲۰ھ میں بمقابلہ امام باقرؒ اور خلیفہ ہشام اُموی کے دعویٰ امامت و مہدویت کیا اور شہید ہوئے، جس پر جوشیلے مخالفین نے مہدی کا انجام سولی پر ہونے کے طعن کئے اور امام زیدؒ شہید کے بھتیجے امام جعفرؒ نے بددعا کی اور محمدؒ بن علیؒ بن عبداللہؓ بن عباسؓ نے ۱۱۷ھ میں دعویٰ خلافت و امامت کیا، جس کا نتیجہ ابو مسلم کا خروج اور قیام خلافت عباسیہ ہوا۔ سنیوں کی چند احادیث مہدی اُن کی تائید میں موجود ہیں۔ پھر سنہ ۱۲۴ھ میں عبداللہ بن علی حسنیؓ نے بمقابلہ خلیفہ عبداللہ ابو العباس عباسی کے دعویٰ کیا۔ اُن کی تائید میں احادیث موجود ہیں۔ پھر سنہ ۱۴۵ھ میں امام محمد بن عبداللہ امام حسنؓ نے جن کا لقب اُن کی پاکیزگی و طہارت کی وجہ سے النفس الزکیہ تھا۔ بمقابلہ خلیفہ ابو جعفر منصور عباسی سنیوں کی چند احادیث اُن کی تائید میں موجود ہیں، جو نام، ولدیت اور حلیہ تک کا تعیّن کرتی ہیں۔ امام ابو حنیفہ

---

[1] رائے بدلنا (مدیر)

اور امام جعفر صادق نے ان کی تائید کی۔ مدینہ حجاز و یمن فتح کیا اور اعلان خلافت و امامت کیا، لیکن ناکامیاب ہوئے۔ وہ اور اُن کے بھائی ابراہیم شہید ہوئے۔ پھر خلیفہ منصور نے النفس الزکیہؓ کے کامیاب دعویٰ سے خائف ہو کر اپنے بیٹے کو اپنا جانشین مقرر کیا اور اس کا نام مہدی رکھا، تاکہ دعویٰ مہدویت آیندہ کے لئے بند ہو جائیں۔ مہدی عباسی ۱۵۸ھ میں خلیفہ ہوئے۔ یہ بڑے سخی، عادل اور کامیاب تھے۔ مہدی کی متعدد احادیث جو سنیوں کے ہاں ہیں۔ اُن پر خوب منطبق ہیں۔ مہدی عباسی دس سال کی خلافت و امامت کے بعد ۱۶۸ھ میں فوت ہوئے۔ اِس عرصہ خلافت کی طرف بھی احادیث میں اشارہ پایا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں دلچسپ بات یہ ہے کہ خلیفہ ابوالعباس عباسی کی وصیت کے مطابق خلیفہ المنصور کے بعد اُن کا بھتیجا عیسیٰ امام اور خلیفہ ہونا چاہئے تھا۔ مگر منصور نے عیسیٰ اپنے بھتیجے کو بحقِ مہدی اپنے پسر کے دست بردار ہونے کے لئے مجبور کیا۔ چنانچہ احادیث میں عیسیٰ کی موجودگی میں مہدی کے امام ہونے کی طرف بھی اشارہ موجود ہے۔ اس عیسیٰ نے مہدی، النفس الزکیہ اور اُن کے بھائی ابراہیم کو شکست دے کر شہید کیا تھا۔ اور مہدی عباسی نے خراسان کے "برقعہ پوش پیغمبر" یعنی مقنع خراسانی کا، جس نے مزدک کے فلسفہ کا مطالعہ کر کے پیغمبری اور اوتار ہونے کا دعویٰ کیا تھا، مقابلہ کیا اور اُس کو صفحہ ہستی سے مٹایا۔ احادیث میں اس کی طرف بھی اشارہ موجود ہے۔ خلیفہ منصور عیسیٰ کی شجاعت و قابلیت کا قائل تھا اور چاہتا تھا کہ عیسیٰ اُس کے پسر مہدی عباسی کا مددگار رہو۔ چنانچہ عیسیٰ اور مہدی کے مل کر اسلام کو فروغ دینے کی طرف بھی اشارہ پایا جاتا ہے۔ پھر ۲۹۶ھ میں امام عبیداللہ فاطمی حسینی نے اپنے باپ امام محمد الحبیب مکتوم کی بیان کردہ پیش گوئی و نص مہدی کے مطابق سلامیہ میں جو حمص کے پاس تھا دعویٰ مہدویت کیا اور شمالی افریقہ فتح کیا اور خلافت و امامت کی۔ یہ اسمٰعیلی تھے۔ یہ مہدی خلافت بنو فاطمہ کے پیش رو ہیں، جنھوں نے افریقہ اور مصر میں ۲۹۶ھ سے ۵۶۷ھ تک خلافت و امامت کی۔ اور المعز نے عزیز کے زمانہ میں حجاز اور شام فتح کیا۔ اور حرمین میں اپنا خطبہ جاری کیا۔ پھر ۵۱۴ھ میں مراکو میں امام محمد ابن تومرت حسنی نے بحوالہ پیش گوئی رسول صلعم اور نص صریح شہرسوس میں دعویٰ مہدویت کیا اور موحدین کی جماعت قائم کی ۵۲۴ھ میں ان کے انتقال کے بعد اُن کے نامزد کردہ خلیفہ امام عبدالمومن نے شمالی افریقہ اور ہسپانیہ فتح کئے اور خاندان موحدین کی بنیاد ڈالی، جس میں امام عبدالمومن کے بھائی یوسف اور ان کے پسر یعقوب المنصور بڑے کامیاب اور عظیم الشان خلیفہ گزرے ہیں۔ انھوں نے بڑے نازک موقعہ پر عیسائیوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کی امداد کی، جیسا کہ مضامین احادیث میں ذکر ہے۔ یہ گروہ مہدیانِ بنو ہاشم اور بنو فاطمہ سے ہے، جن کو بوجہ خاندانِ نبوت ہونے کے نص امامت و مہدی کے متعلق یقینی علم ہونا لازم ہے۔

پس مذکورہ تاریخی واقعات کی موجودگی سے معلوم ہوتا ہے کہ اماموں اور مہدی کی منصوصیت اور نامزدگی کا دعویٰ پہلی صدی ہجری کے بعد وضع ہوا۔ مذکورہ مہدیوں کی بھیڑ کے علاوہ دنیا میں غیر بنو ہاشم اقوام میں سے بھی متعدد دعوے داران مہدویت گزرے ہیں، مگر وہ دعویٰ منصوصیت نہ کرتے تھے۔ ان کا دعوے غیر منصوصہ مہدویت کا عموماً احادیث

Marfat.com

اہل سنّت والجماعت کے مطابق تھا۔ اور علیٰحدہ بحث کا محتاج نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں صرف یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ سنّیوں کے ہاں بعض احادیث مہدی، مہدی کو کسی خاص قوم سے قرار نہیں دیتیں، بلکہ عام اُمّتِ مسلمہ سے ہونا بیان کرتی ہیں۔ غیر ہاشم مدعیوں نے اُن احادیث سے استفادہ کیا ہے۔ یہ احادیث غالباً پہلی قسم کی احادیث کی روک اور اُس کے اثر کو زائل کرنے کے لئے وضع ہوئیں، یہ بھی ممکن ہے کہ عجمیوں نے وضع کی ہوں۔

اس مضمون کا مقصد یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ آمد مہدی کی صحّت وعدم صحّت پر بحث کا دروازہ کھولا جائے۔ مدّعا صرف یہ ہے کہ کتنی بے بنیاد شے ہے، جس پر دینی رنگ میں معرکہ جدال وقتال گرم ہوتا رہا ہے اور ہوتا ہی رہے گا۔ جب تک مسلمان قرآن حکیم کی پناہ میں نہ آجائیں گے، اس عقیدہ کی نہ کوئی دینی حیثیت ہے، نہ تاریخی عظمت، نہ سیاسی حکمت، محض نفسِ دُنیوی کی کارفرمائیاں ہیں، جن کے بطن سے ہمیشہ یہ مولودِ نامسعود متولد ہوتا رہا ہے۔

ایصال ثواب

— علامہ تمنّا عمادی مجیبی پھلواری شریف

"ایصال" کے معنی فرستادن، پہنچانا۔ "ثواب" کے معنی مُزدِ عمل۔ مزدوری۔ یعنی ایک مسلمان کوئی عمل نیک خود کرکے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرے کہ میں نے جو یہ عمل نیک کیا ہے اس کا اجر اسکی مزدوری جو مجھ کو ملتی وہ فلاں مسلم کو ملے میں نے اسکو بخش دیا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی مسلمان کوئی عمل نیک کرے۔ اس نیت سے اور اللہ تعالیٰ سے یہ کہہ کر کہ میں یہ فلاں مسلمان کی طرف سے کر رہا ہوں، اسلئے اس کار ثواب یعنی اس کا اجر اس کی مزدوری اُسی کو ملے۔

قرآن مبین میں ان دونوں طریقوں میں سے کسی طریقے کی تعلیم نہیں فرمائی گئی۔ عہد نبوی میں کوئی معمول بہ طریقہ نہ تھا کہ جب کوئی مرے تو اُس کیلئے ایصال ثواب کیا جائے۔ اسیطرح عہد خلفائے راشدین میں بھی ایصال ثواب کا کوئی معمول حج بدل وغیرہ کی روایتیں یا مُردہ کی طرف سے قربانی اور سعد بن عبادہ والا واقعہ، یہ ساری روایتیں بعد مشتبہ ہیں اور ناقابل اعتبار، محدثانہ طریقہ سے اگر ان کی تنقید کی جائے تو تھوڑی سی کوشش میں ان کی حقیقت کیطرح واضح ہو جائے۔ چونکہ یہ مختصر سا مضمون اس کا متحمل نہیں اسلئے سردست ان سے قطع نظر کرتا ہوں۔

کیا قرآن مبین اس کے متعلق خاموش ہے؟ ایک سوال یہ ضرور پیدا ہوتا ہے کہ

Marfat.com

ایصال ثواب کے مذکورہ بالا دونوں طریقے مذکور نہیں ہیں۔ تو اس سے تو اسی قدر معلوم ہوا کہ قرآن مبین ایصال ثواب کے متعلق خموش ہے تو پھر وان لم تجد فبسنۃ رسولہ کے مطابق ہم اسکو حدیثوں میں کیوں نہ ڈھونڈھیں؟ بعض روایتوں کو جرح و تعدیل اور عام عقل و درایت کی کسوٹی پر کسنے سے کمزور معلوم ہو سکتی ہیں، مگر ممکن ہے کہ وہ صحیح ہوں۔ ایک ہزار سال سے جس چیز پر اُمت کا تعامل چلا آرہا ہے وہ کیوں خواہ مخواہ بے اصل مان لی جائے۔

اس سوال کے متعلق مجھے سب سے پہلے تو یہی کہہ دینا تھا کہ جس چیز کے متعلق قرآن خموش ہے اور اس کا تعلق عقاید یا عبادات سے کہا جاتا ہے تو پھر وہ دین میں کان لم یکن شیئاً مذکورا کا حکم رکھتی ہے اور بالکل بے اصل چیز ہے۔ عقاید و عبادات سے متعلق دین اسلام میں کوئی ایسی چیز نہیں پیش کی جا سکتی جس سے قرآن خاموش ہو اور وہ صرف روایات سے ثابت ہو۔ مگر چونکہ اس جواب سے ممکن ہے کہ ایک نیا موضوع بحث چھڑ جائے اور ایصال ثواب کا مسئلہ بالائے طاق رہ جائے اور یہاں تو یہ واقعہ بھی نہیں ہے کہ قرآن مبین مسئلہ ایصال ثواب کے متعلق بالکل خموش ہے۔ اسلئے صاف یہی کیوں نہ کہہ دوں کہ قرآن مبین اسکے متعلق ہرگز خموش نہیں۔ دیکھئے سورۂ والنجم میں صاف فرما دیا گیا وان لیس للانسان الا ما سعی اور سورہ حم السجدہ میں ارشاد ہے من عمل صالحا فلنفسہ اور سورہ والطور میں ہے کل امرئ بما کسب رھین ان تین آیتوں سے تین باتیں بعبارۃ النص کل رہی ہیں۔

۱۔ انسان کا حق اپنے ہی سعی و عمل پر ہے، دوسرے کی سعی و عمل پر نہیں۔

۲۔ جو شخص بھی کوئی نیک عمل کرتا ہے۔ اس کا نفع اُسی کرنے والے کو حاصل ہو سکتا ہے، کسی دوسرے کو نہیں۔

۳۔ ہر شخص اپنے کسب و عمل میں رہن ہے۔ اس معاملہ رہن کو توڑنے یا ٹوٹ جانے کا جو طریقہ خود اللہ تعالیٰ نے دیا ہے۔ اس کے سوا کسی اور طریقے سے کوئی شخص بھی بطور خود اس معاملہ رہن کو توڑ نہیں سکتا۔ مثلاً عمل نیک کے محو ہو جانے کے جو اصول قرآن میں مذکور ہیں، اُن کے سوا کسی اور طریقے سے عمل نیک کا رہن نہیں ٹوٹ سکتا۔ اسی طرح عمل بد کے عفو و محو ہو جانے کے جو جو طریقے قرآن میں مذکور ہیں، اُن کے سوا کسی اور طریقے سے عمل بد کا رہن بھی نہیں ٹوٹ سکتا۔ غرض جس نے رہن کیا ہے۔ وہی اس رہن کو توڑ سکتا ہے بطور خود یا کسی خود ساختہ قاعدے سے بھی اُس کے باندھے ہوئے عقدِ رہن کو توڑ نہیں سکتا۔

ایصال ثواب کے جواز کا عقیدہ ان تینوں آیات قرآنیہ کے بالکل خلاف ہے اور یہ تینوں آیات کریمہ بصراحت ایصال ثواب کے جائز ہونے کے عقیدہ کو باطل کر رہی ہیں۔ اسکو اسطرح مطابق کر کے دیکھا جائے تو اصل مسئلہ پر کافی روشنی پڑ سکتی ہے:۔

قرآن مبین	ایصال ثواب کا قائل
۱۔ انسان کا حق اپنی ہی سعی و عمل پر ہے۔	۱۔ انسان کا حق دوسرے کی سعی و عمل پر بھی ہے۔

[illegible] کوتاہ کوئی قابل ذکر بات نہیں۔

Marfat.com

۲- جو شخص بھی کوئی عمل نیک کرتا ہے اُسکا نفع اُسی کرنیوالے کو حاصل ہوتا ہے، دوسرے کو نہیں۔

۳- ہر شخص اپنی کمائی میں گرو ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی اپنے بیان کردہ قرآنی اصول کے مطابق اس رہن کو توڑ سکتا ہے۔ کوئی شخص بطور خود کسی ایسے طریقے سے جس کو اللہ تعالیٰ نے نہیں بتایا، اس رہن کو نہیں توڑ سکتا۔

۲- یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص ایک عمل نیک کرے اور اسکا اجر و ثواب کسی دوسرے کو بخش دے۔

۳- اللہ تعالیٰ کے باندھے ہوئے عقد رہن کو ایسے طریقے سے جس کو قرآن مبین میں نہیں بتایا گیا ہے ہم بطور خود اللہ تعالیٰ سے دعا کرکے توڑ دے سکتے ہیں یا توڑوا سکتے ہیں۔

اس لئے یہ کہنا کہ قرآن مبین ایصال ثواب کے متعلق خموش ہے، بالکل غلط ہے۔ اگر ایصال ثواب کا طریقہ جائز اور صحیح ہوتا تو یقیناً قرآن مبین میں اس کا ذکر ہوتا اور جس طرح عام متوفی مسلمانوں کے لئے دعائے رحمت و مغفرت کی تعلیم فرمائی گئی۔ اُسی طرح ایصال ثواب کی بھی ضرور تعلیم ہوتی۔ عام مسلمان نہیں تو کم سے کم اہل قرابت اور والدین کے لئے تو ایصال ثواب کا حکم ہوتا۔

دعائے رحمت و مغفرت اور ایصال ثواب۔ ایصال ثواب کے قائل، ایصال ثواب کو ثابت کرنے ہوئے دعائے رحمت و مغفرت کی تعلیم کے سلسلہ میں جو آیتیں آئی ہیں، عموماً اُن کو پیش کردیا کرتے ہیں۔ حالانکہ دعائے رحمت و مغفرت اور ایصال ثواب میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ دعائے رحمت و مغفرت ایک سفارش ہے، بارگاہ الٰہی میں چاہے وہ سُنے یا نہ سُنے اور ایصال ثواب خود جو عمل نیک وہ کرتا ہے، اسکی مزدوری جو اُس کو ملتی اپنی مزدوری دوسرے کو دلواتا ہے اس لئے اس میں ایک حق، اور دباؤ کی صورت پیدا ہے۔ مثلاً ایک نوکر آپ ہی سے کہے کہ آپ فلاں محتاج کو ایک روپیہ دیدیجئے اور ایک صورت یہ ہے کہ وہ اپنے مشاہرے تنخواہ میں سے ایک روپیہ آپ سے اُس محتاج کو دلوادے۔ کیا یہ دونوں صورتیں ایک کہی جاسکتی ہیں؟ پہلی میں آپ کو اختیار ہے، چاہے دیجئے یا نہ دیجئے اور دوسری صورت میں آپ دے دینے پر مجبور ہیں۔ اگر آپنے نہ دیا تو یہ آپ کی زیادتی ہوگی۔

عبادت اور ثواب۔ ایک بہت بڑا دھوکا ایک مدت دراز سے کھایا جارہا ہے، سمجھا جاتا ہے کہ ہر عمل پر جنت ملتی ہے نعمت ملتی ہے۔ مثلاً ایک رکوع قرآن مجید پڑھا اور جنت میں ایک دیگ پلاؤ تیار کرکے رکھ دیا مرنے کے بعد خود نہیں کھایا۔ زندگی ہی میں دوسرے کو دلوادیا۔ دو رکعتیں پڑھیں اور جنت میں ایک قلیہ کا حلوا تیار ہوگیا۔ وہ کسی دوسرے کو دلوادیا گیا۔

حقیقت حال یہ ہے کہ ہر مسلم اپنی مدت عمر میں اپنے عقائد صحیحہ کی نگہداشت کے ساتھ اعمال حسنہ

Marfat.com

دنیا سے باایمان اٹھا تو یا تو وہ مقربوں میں ہے یعنی السبقون[۵۱] الاولون من المھجرین والانصار والذین اتبعوھم باحسان میں ہے اور رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ والی جماعت میں شامل ہے یا اصحاب الیمین میں ہے یعنی واٰخرون[۵۲] اعترفوا بذنوبھم خلطوا عملا صالحا واٰخر سیئا تو اس کے لئے بھی یہ وعدۂ الٰہی ہے کہ عسی اللہ ان یتوب علیھم انّ اللہ غفور رحیم اہل جنت اور نیک کاروں کی یہی تقسیم ہے اور بس۔ مگر اس کا پتہ کہ وہ کس درجہ کا جنتی ہے۔ اس کے موت تک کے عقاید و اعمال کے بعد ہی ہو سکتا ہے اور اس کا دفتر بھی مرنے کے بعد ہی مرتب ہو سکتا ہے کیوں کہ الاعتبار[۵۳] بالخواتیم اور اس کے لئے عبادت کی مقدار و کمیت سے زیادہ اُنکی صحت و کیفیت کا اعتبار مرعی ہوتا ہے۔

عبادات کی غرض تزکیہ نفس ہے ورنہ کچھ وقت یا کچھ پیسے صرف کر دینے سے کچھ نہیں ہوتا۔ کہا جاتا ہے کہ کتنے لوگوں کی نمازیں اور روزے قیامت میں اُن کے منہ پر پھینک دئے جائیں گے۔ یعنی قابل قبول نہ ٹھہریں گے۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ اُن کا اثر تزکیہ عابد کے نفس پر دنیا میں مترتب نہیں ہوا۔ نمازیں تو پڑھتا رہا اور ساری عمر پڑھتا رہا۔ مگر فانّك لم تصلّ[۵۴] کی طرح، روزے تو بہت رکھے مگر لعلکم تتقون[۵۵] کا مصداق نہ بنا۔ حج تو بہت کئے مگر جج کی بھٹی میں جب پڑا تو اُس کے ایمان کا وہ سونے کا سارنگ اُڑ گیا اور وہ سونا لوہا بن کر رہ گیا۔ زکوٰتیں تو عمر بھر دیتا رہا مگر ان کو من و اذیٰ[۵۶] کے ذریعہ ہمیشہ ضائع کرتا رہا۔ اس لیے درحقیقت پاکی نفس کے بغیر کسی عبادت کا کوئی اجر نہیں ہے۔ قرآن میں صاف فرما دیا گیا ہے کہ قد افلح من تزکیٰ اس لئے آخرت کی کامیابی نفس کی پاکیزگی ہی پر موقوف ہے، عبادات کے ظاہری ڈھانچوں پر نہیں۔ اسی لیے ایک شخص جو سو برس کی عمر پا کر مرا اور اسی سال تک عبادتیں کرتا رہا اور دوسرا جو پچیس سال کی عمر میں مر گیا اور اس نے پانچ ہی برس تک عبادتیں کیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی پانچ سال کی عبادت اس کی اسی سال کی عبادت سے کہیں زیادہ اجر اس کو اس مرگ کو دلوا دے۔ اس لئے کہ تزکیہ نفس کثرتِ عبادت پر موقوف نہیں ہے بلکہ صحتِ عبادت پر موقوف ہے اور صحت عبادت نفس کے پاک ہونے کے بغیر اللہ کے حضور معتبر نہیں۔ نماز کی خاصیت بتا دی گئی کہ بیشک عن الفحشاء والمنکر (بے حیائی اور بُرائی سے روکتی ہے) روزے فرض کئے گئے لعلکم تتقون (تاکہ تم متقی بنو) تو اگر دنیا میں

---

۵۱ وہ مہاجر و انصار جنھوں نے سبقت کی اور وہ لوگ جنھوں نے نیکی میں ان کی پیروی کی۔

۵۲ دوسرے لوگ جنھوں نے اپنے گناہوں کا اقرار کر لیا اور ملے جلے نیک و بد عمل کئے۔ قریب ہے کہ خدا غفور و رحیم انکی طرف متوجہ ہو۔

۵۳ اعتبار کا تعلق خاتمے سے ہے۔

۵۴ تم نے نماز نہیں پڑھی ۵۵ تاکہ تم متقی بنو ۵۶ احسان جتانا اور تکلیف دینا

ہماری نمازیں ہمیں فحش و منکر سے مانع نہ ہوسکیں۔ ہمارے روزے ہم میں تقویٰ نہ پیدا کرسکے تو یہ ہماری نمازیں اور ہمارے رونے غرق مئے ناب اولیٰ ہیں۔ دنیا میں یہ عبادتیں بہت بڑا عابد و زاہد جو کچھ بھی مشہور کردیں، مگر مرنے کے بعد کچھ بھی کام نہ آسکیں گی اور میزان قیامت میں ان کا مطلقاً کچھ وزن نہ ہوگا۔

اسی طرح تلاوت قرآن مبین ہے کہ ہمیں تدبر فی القرآن کے ساتھ تلاوت کا حکم ہے۔ ورنہ علیٰ قلوب اقفالہا (دلوں پر تالے ہیں) کا مصداق بننا پڑے گا۔ ہمیں ترغیبی و ترہیبی آیات سے نفس کی پاکیزگی کا اثر حاصل کرنا ہوگا۔ و نواہی کے مواقع میں بزبان ایمان و ایقان سمعنا و اطعنا (سن کر اطاعت کی) کہتے رہنا ہوگا۔ وعظ و عبرت کی آیتوں کے وقت نصیحت و عبرت کے سبق لینا ہوں گے اور واذا[1] تلیت علیہم ایتہ زادتہم ایمانا اور تقشعر منہ جلود الذین یخشون ربہم ثم تلین جلودہم و قلوبہم الیٰ ذکر اللہ کا مورد بن کر یا بننے کی کے ساتھ تلاوت کرنا ہوگی، اسی طرح اور عبادتوں کو بھی سمجھ لیجئے۔

تو ہماری نماز ہمیں کو فحش و منکر سے روک سکتی ہے، ہمارے روزے ہم ہی میں تقویٰ پیدا کرسکتے ہیں اور ہماری تلاوت قرآن مجید ہمارے ہی دل کو اللہ کی یاد کی طرف لگا کر ہمارے ہی ایمان میں زیادتی پیدا کرسکتی ہے غرض ہماری ہر عبادت خود ہمیں میں اثر تزکیہ نفس ڈال سکتی ہیں۔ اگر ہم چاہیں کہ فحش و منکر سے جو رکاوٹ ہم میں پیدا ہوتی ہے یا تقویٰ جو ہم میں آگیا ہے، خشیت الٰہی و زیادت ایمان جو ہم کو حاصل ہوتی ہے اور تزکیہ کا جو اثر ہمارے نفس پر پڑا ہے، ان چیزوں کو کسی دوسرے زندہ یا مُردہ کی طرف کسی طرح منتقل کردیں تو ؎

ایں خیال است و محال است و جنوں

دعائے محال بعض بھولے بھالے حضرات یہ فرماتے ہیں کہ ہم نے مانا کہ عبادت تزکیہ نفس کی تاثیر بغیر مفید نہیں اور بے شک تزکیہ نفس کی تاثیر ایسی چیز ہے کہ بظاہر ایک شخص سے دوسرے شخص کی طرف منتقل ہوسکتی۔ مگر ہمارا ایمان ہے کہ ان اللہ علیٰ کل شئ قدیر اس لئے اگر ہم اللہ تعالیٰ کے اس حکم کے مطابق ادعونی استجب لکم دعا کریں کہ بارالٰہی فلاں عبادت جو میں نے کی اور اس سے جو تزکیۂ نفس کا اثر مجھ پر ہوا ہے وہ فلاں شخص کی طرف تو محض اپنی قدرت کاملہ سے منتقل کردے۔ یا یہ عبادت میں فلاں کی طرف کر رہا ہوں۔ اس لئے اس کا اثر تزکیۂ نفس فلاں فلاں شخص پر مترتب ہو تو آخر یہ دعا کیوں قبول نہ ہوگی کیا اللہ تعالیٰ اس پر قادر نہیں ہے؟

---

[1] جب ان پر آیات الٰہی تلاوت کیجاتی ہیں تو ان کا ایمان بڑھتا ہے جو لوگ خدا سے ڈرتے ہیں انکے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں پھر ان کی جلدیں نرم ہوکر دل اللہ کے ذکر کی طرف مائل ہوجاتے ہیں۔

Marfat.com

تو میں ان سیدھے سادے حضرات سے یہ عرض کرتا ہوں کہ بھوکوں کو کھانا کھلایا کیجئے بلکہ خود پیٹ بھر کر اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائیے کہ یا اللہ! یہ شکم سیری جو مجھ کو حاصل ہوئی ہے، فلاں بھوکے تک اپنی قدرتِ کاملہ سے منتقل فرمادے۔ اور جاڑوں میں کبھی غربا و مساکین میں کمبل تقسیم نہ فرمائیے بلکہ خود عمدہ لحاف کمبل اوڑھ کر دعا فرمائیے کہ بارِ الٰہی! یہ جو گرمی مجھ کو محسوس ہو رہی ہے جتنے لوگ جاڑے سے کپکپا رہے ہیں، اُن تک منتقل فرمادے۔ کیونکہ انّ اللہ علیٰ کلّ شئٍ قدیر اور اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ ادعونی استجب لکم اور وعدہ ہے کہ اُجیب دعوۃ الداع اذا دعان۔ آپ یہ دعا کر سکتے ہیں کہ یا اللہ فلاں بھوکے کی شکم سیری کا کوئی سامان کردے۔ یہ دعا کر سکتے ہیں کہ یا اللہ فلاں غریب مسکین جو جاڑے سے کانپ رہا ہے۔ اسکے لئے کوئی سامان کمبل وغیرہ کا کردے۔ یعنی کسی کو توفیق دے دے کہ اُس کو کھلادے اُس کو کمبل خرید کر دے دے۔ مگر وہ دعائیں نہیں کر سکتے جن کا ذکر میں نے پہلے کیا۔ اسی طرح ایک لڑکا یونیورسٹی کا امتحان دینے کے لئے گیا ہے تو آپ یہ دعا کر سکتے ہیں کہ یا اللہ! فلاں لڑکا امتحان پاس کر جائے مگر یہ دعا نہیں کر سکتے کہ فلاں فلاں مسائل جو مجھ کو یاد ہیں میرے ذہن سے اُس لڑکے کے ذہن تک منتقل فرمادے۔ غرض امر محال کی دعا قطعاً ممنوع ہے۔ آپ ایک بیمار کی شفا کے لئے دعا کر سکتے ہیں مگر خود جواہر مہرہ کھا کر یہ دعا نہیں کر سکتے کہ یہ جواہر مہرہ جو میں نے کھایا ہے اور اُس سے جو تقویتِ روح مجھ کو حاصل ہوئی وہ اُس بیمار تک منتقل ہو جائے۔ بالکل اسی طرح آپ کسی زندہ یا مردہ کے لئے دعائے رحمت و مغفرت و ترقی درجات وغیرہ کر سکتے ہیں مگر خود کوئی عمل نیک کر کے اُس سے جو اثر تزکیہ آپ کے نفس پر مترتب ہو سکتا ہے، اس کو کسی دوسرے کی طرف منتقل کرنے کی دعا نہیں کر سکتے خصوصاً جب اللہ تعالیٰ نے فرمادیا ہے کہ من[۵۱] عمل صالحا فلنفسہ۔ لیس[۵۲] للانسان ما سعیٰ۔ کلّ[۵۳] امرئ بما کسب رھین۔ کیا ان آیتوں کے بعد بھی اور ان روایات عقلیہ قرآنیہ کے باوجود بھی ایصال ثواب کو جائز و صحیح سمجھنا یریدون ان یبدلوا کلام اللہ کا مصداق نہ ہوگا؟

کچھ روایات سے متعلق۔ میں نے روایات سے اسوقت بحث کرنے کا قطعی ارادہ نہیں کیا ہے، بلکہ اس سے احتیاط کی ہے اور بشرطِ ضرورت اس کو آئندہ کے لئے اٹھا رکھا ہے مگر اتنا کہہ دینا ضروری ہے کہ جو روایتیں نص قرآنی کے صراحۃً مخالف ہوں کم سے کم اُن کو تو موضوع سمجھنا چاہئے۔ اور ایسا تو نہ کیا جلے کہ ان روایتوں کیلئے آیات قرآنیہ کو اُن کے مرکز عبارۃ النص سے تاویلات رکیکہ کے ذریعہ ہٹادینے کی جرأت اختیار کرنا پڑے۔

یہ خوب یاد رکھنا چاہئے کہ روایتیں موضوع ہو سکتی ہیں۔ ائمہ مجتہدین سے غلطیاں ہو سکتی ہیں اور ایک ہزار

---

۵۱ جو نیک عمل کوئی کرتا ہے، اسی کے لئے ہے۔

۵۲ انسان کو اپنی ہی کوششوں کا پھل ملے گا۔

۵۳ ہر شخص اپنے کسب و عمل میں گرو ہے۔

Marfat.com

سال کا تعامل مبنی پر غلط ہوسکتا ہے۔ مگر قرآن مبین کی ایک آیت بھی اپنے ماثبت[1] بعبارۃ نصھا او اقتضاء نصھ
کے خلاف مفہوم نہیں پیدا کرسکتی۔ اسی طرح کسی آیت کا وہ مفہوم جو اُس کی دلالۃ النص یا اشارۃ النص سے نکالا جائے
یا کسی دوسری آیت کے اس مفہوم کے خلاف نہیں ہوسکتا جو کسی آیت کی بھی عبارۃ النص یا اقتضاء النص سے نکل رہا ہو۔

قرآن کے مفہوم کو باقی رکھنے کے لئے حدیثوں کی تاویل کیجاسکتی ہے اور کرنی چاہیئے مگر حدیثوں کے مفہوم کو باقی رکھنے
کے لئے آیات قرآنیہ کی تاویل حد درجہ خطرناک ہے۔ کیوں کہ حدیثیں غلط اور موضوع ہوسکتی ہیں۔ قرآن کی تو کوئی
آیت ضعیف بھی نہیں ہوسکتی۔

ایک آخری التجا۔ میں نے جو کچھ عرض کیا ہے، محض احقاق حق کے لئے لکھا ہے، اسکے سوا میری کوئی غرض
نہیں وکفیٰ باللہ شھیدا۔ اسلاف کی عزت واحترام میرے دل میں بھی اُسی قدر ہے جس قدر ایک مسلم کے دل میں ہونی
چاہیئے۔ مگر میرا ایمان ہے کہ تلک امۃ قد خلت لھا ما کسبت ولکم ما کسبتم ولا تسئلون عما کانوا یعملون[2]
مجھ سے قیامت کے دن کبھی نہیں پوچھا جائے کہ فلاں فلاں اماموں اور راویوں کا تم نے کیوں اتباع نہ کیا؟ مجھ سے یہی
پوچھا جائے گا کہ تم نے قرآن ورسول کا اتباع کیوں نہ کیا؟ البتہ رسول اس وقت میرے سامنے نہیں ہیں کہ اُن سے
حدیثوں کی تصحیح کرسکوں مگر قرآن ہے۔ ھذا کتابنا ینطق علیکم بالحق والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ

وقف کی دینی حیثیت

(علامہ حافظ محمد اسلم جیراجپوری)

دولت مند مسلمانوں نے جو اوقاف مختلف اغراض مثلاً مدرسوں، مسجدوں، خانقاہوں یا امام باڑوں وغیرہ کے
کئے ہیں، ان کی دینی حیثیت کیا ہے؟ یہ سوال کئی مخلص احباب نے مجھ سے کیا۔ اس لئے میں نے اس مسئلہ کی تحقیق اور تبیین کی۔ میں نے دیکھا کہ عام طور پر ائمہ حدیث وفقہ کے نزدیک وقف کی شرعی حیثیت مسلّم چلی آرہی ہے۔ انکے بیانات سے وقف کی جو حقیقت میں سمجھ سکا، وہ مختصر لفظوں میں یہ ہے:-

ا۔کسی مال یا جائداد کو مالک اپنی ملکیت سے نکال کر ایک خاص غرض کے لئے روک دے کہ اس کی آمد
پیداوار اُسی مخصوص غرض میں صَرف کی جائے۔

---

[1] جو اس سے صراحتاً ثابت ہو۔

[2] یہ لوگ گزر گئے اُن کے عمل اُن کے لئے ہیں اور تمہارے عمل تمہارے لئے انکے عمل سے متعلق تم سے سوال نہیں کیا جائے گا۔

Marfat.com

۲- بہت سے فقہانے تصریح کی ہے کہ اس میں ابد تک کی شرط لگانا ضروری ہے، یعنی وقف ہمیشہ کے لئے ہونا چاہئے ورنہ صحیح نہ ہوگا۔

۳- وقف کرنے والے کا فرض ہے کہ وہ کسی کو اس کا متولّی بنادے اور اس سلسلۂ ولایت کا ہمیشہ کیلئے سامان کرجائے۔

۴- موقوفہ مال کی آمدنی یا موقوفہ جائداد کی پیداوار ابدالآباد تک واقف کی معیّنہ غرض کے سوا بشرطیکہ وہ دین کے خلاف ثابت نہ ہو، کسی دوسرے کام میں صرف نہ ہوسکے گی۔

۵- الوقف لا یملك ولا یُباع ولا یوھب ولا یورث یعنی وقف نہ کسی کی ملکیت ہوتا ہے نہ بیچا جاتا ہے نہ ہبہ کیا جاتا ہے نہ اس میں وراثت جاری ہوتی ہے۔

یہ وقف میرے نزدیک قرآن اور عقل دونوں کے خلاف ہے۔

قرآن کے خلاف اسوجہ سے ہے کہ اس میں جتنی صورتیں مال کے انتقال، یعنی ایک کے ہاتھ سے نکل کر دوسرے کے ہاتھ میں جانے کی بیان کی گئی ہو، مثلاً خرید و فروخت، وصیّت و وراثت، ہبہ و صدقہ، زکوٰۃ و خیرات وغیرہ، ان میں کہیں اشارۃً یا کنایۃً بھی ایسے وقف کا ذکر نہیں ہے جو کسی کی ملکیّت میں نہ آئے۔ بعض فقہانے اسکو وصیّت میں داخل کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن یہ صحیح نہیں ہے، کیوں کہ وصیّت اور وقف میں دو نمایاں فرق ہیں:-

۱- وقف میں فقہاء کے بیان کے مطابق وقف کرتے ہی مال واقف کی ملکیّت سے خارج ہوجاتا ہے، بخلاف وصیّت کے کہ اس میں موصی کے مرجانے کے بعد وصیّت کا مال دوسرے کے ہاتھ میں جاتا ہے۔

۲- وقف میں مال واقف کی ملکیّت سے نکل کر کسی کی ملک نہیں ہوتا۔ بخلاف اسکے وصیّت میں موصی کے بعد موصےٰ لہٗ اس کا مالک ہوجاتا ہے اور اپنی خواہش کے مطابق اس کو صرف کرتا ہے۔

ایسی کوئی وصیت قرآن سے ثابت نہیں کی جاسکتی، جس پر موصی کے مرنے کے بعد کسی کی ملکیت نہ قائم ہو۔

اور وقف عقل کے خلاف حسب ذیل وجوہ سے ہے:

۱- مال و جائداد فطرۃً مملوک ہیں۔ ایسا نہیں ہوسکتا کہ وہ کسی کی ملکیّت میں نہ ہوں۔

یہی دشواری تھی، جس کی وجہ سے بعض فقہا کو یہ کہنا پڑا کہ مال موقوفہ کا مالک اللہ ہوتا ہے۔ اگر یہ صورت ہے، تو اس پر تصرّف بھی اللہ ہی کا ہوگا اور امام وقت جو حکومت الٰہی کا نائب ہوتا ہے۔ اپنی صواب دید کے مطابق اس کو صرف کرے گا نہ کہ مردہ کی خواہش کے مطابق۔

۲- وقف کرنے میں مال جب واقف کی ملکیت سے نکل گیا تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ اب اس پر اس کا تصرّف نہیں رہا۔ یہ بیک وقت اجتماع نقیضین ہے کہ وہ مالک مال کا بھی نہیں ہے۔ مگر وہ خرچ ہو رہا ہے اُسی کی خواہش و ارادہ کے مطابق۔

۳- مال یا جائداد سے جو آمدنی یا پیداوار ہوتی ہے، وہ زندوں کی محنت سے ہوتی ہے، اسلئے اس کے اوپر زندوں

ہی کو متصرف بھی ہونا چاہیئے۔ مُردہ کی خواہش کا اس پر مسلّط ہونا کسی صورت سے جائز نہیں قرار پا سکتا۔ کیونکہ اس اکثر حالات میں نقصان ہوتا ہے۔ وقف کرنے والے کو کیا خبر کہ کل زمانہ کی ضروریات کا تقاضا کیا ہوگا؟ یہ تو نہیں سمجھ سکتے ہیں۔

چنانچہ خود ایک مضحکہ خیز معاملہ میرے شہر میں درپیش ہے۔ وہاں ایک وقف تعزیہ اور امام باڑہ کے اخراجات کیلیے ہے۔ جو لوگ اس کے متولی ہیں وہ اہلِ سنت ہیں اور اب اہل حدیث ہوگئے ہیں جو ان امور کو شرک سمجھتے ہیں اگر وقف کے شرائط کے مطابق ان کو یہ سب مشرکانہ رسوم ادا کرنے پڑتے ہیں۔ وہ ہر چند چاہتے ہیں کہ ہم اس امام باڑہ کو مدرسہ بنالیں اور وقف کی آمدنی کو تعلیم پر صرف کریں، لیکن نہیں کر سکتے۔ اگر مقدمہ بھی دائر کریں کہ یہ امور شریعت کے خلاف ہیں لہذا فقہاء کے فتووں کے مطابق ہم کو اجازت دی جائے کہ ہم اس آمدنی کو دوسری جائز مد میں صرف کریں تو واقف کی ذرّیت جو شیعہ ہے اسکو عین مذہب کے مطابق ثابت کر دیگی۔

علاوہ بریں یہ سلسلۂ وقف اگر جائز قرار دیا جائے اور اسی طرح جاری رہے تو نہ معلوم دولت مند کس قدر جائدادیں وقف کر ڈالیں گے، جن سے آئندہ نسلوں پر دنیا تنگ ہو جائے گی۔ آج بھی اگر اسلامی ممالک میں اوقاف کا شمار کیا جائے، تو ان کی آمدنی سالانہ کروڑوں روپیہ تک پہنچتی ہے، جس کا بڑا حصّہ بے کار مصارف میں ضائع ہو جاتا ہے۔ بعض سادہ دل بزرگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ اوقاف ملّت کا سرمایہ ہیں، جن سے بڑے بڑے قومی کام چل سکتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ملّت کا سرمایہ نہیں بلکہ مُردوں کا سرمایہ ہیں جو اُن کے مخصوص اغراض سے وابستہ ہیں ان میں سے کچھ تو مفید۔ لیکن زیادہ تر غیر مفید کاموں میں صرف ہو رہے ہیں۔

۴۔ وقف کر دینے سے مال جب واقف کی ملکیت سے خارج ہوگیا تو اسکو اس پر تولیت کا حق کہاں رہا؟ اس نے اسوقت کسی کو متولی بنایا تھا، جب وہ اس کا مالک تھا تو اسکی ملکیت ختم ہوتے ہی متولی کی ولایت بھی ختم ہوگئی، کیونکہ حق تولیت کی بنیاد حق ملکیت پر تھی۔ جب یہ نہیں رہا تو وہ بھی نہیں رہا۔

الغرض عقلاً وقف میں اس قدر قباحتیں ہیں کہ وہ جائز ہو ہی نہیں سکتا۔

میرا خیال ہے کہ اُسوقت جبکہ اسلامی خلافت استبدادی حکومت بن گئیں اور مسلمانوں میں سرمایہ داری آگئی دولت مندوں نے جہاں مال سے دنیاوی آسائشیں حاصل کیں، وہاں یہ بھی چاہا کہ اس سے ایک مستقل جائداد آخرت کے لئے بھی بنالیں، جس کا ثواب ابد تک ملتا رہے، اس لئے وقف کا طریقہ اختیار کیا۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ قانونی امور میں بہت باریک بیں تھے، وقف کو جائز نہیں سمجھتے تھے۔ امام ابو یوسف بھی جو ان کے شاگرد اور قاضی القضاۃ تھے، اس مسئلہ میں اپنے اُستاد کے تابع تھے، مگر بعد میں انکی رائے بدل گئی۔ امام سرخسی لکھتے ہیں

وکان ابو یوسف یقول اوّلاً یقول ابی حنیفۃ ولکنّہٗ لما امام یوسف پہلے ابوحنیفہ کے قول پر تھے لیکن

Marfat.com

خرج مع الرشید فرأی وقوف الصحابة بالمدینة ولو احیها رجع فافتی بلزوم الوقف

کتاب المبسوط ج ۱۲ صـ۲۷)

ہارون الرشید کے ساتھ حج کیا اور مدینہ اور اس کے اطراف میں صحابہ کرام کے اوقاف دیکھے تو ان کے قول سے رجوع کرلیا اور وقف کے جواز کے فتوے دینے لگے۔

امام سرخسی کے بیان کے مطابق امام ابوحنیفہ کے نزدیک "وقف" یا "حبس" کا مفہوم صرف یہ تھا کہ وقف کرنے والا مال کو اپنی ملکیت میں روک لے اور اس کے منافع کو صدقہ کردے۔ یقیناً اس صورت کے جواز میں کوئی رکاوٹ نہیں۔ اس کی مثال عاریت کی ہے جو دینے والے کی ملکیت میں رہتی ہے مگر نفع اُٹھانے کا حق دوسرے کو دیدیتا ہے۔ لیکن اس صورت میں ظاہر ہے کہ واقف کے مرنے کے بعد مال موقوفہ ورثہ میں تقسیم ہوگا کیونکہ وہ مورث کی ملکیت میں ہے۔

وقف کے جواز پر فقہا کا استدلال قرآن سے مطلق نہیں ہے بلکہ صرف اس روایت سے ہے کہ حضرت عمرؓ کو خیبر میں ایک اچھا نخلستان ملا تھا۔ جس کا نام ثمغ تھا۔ اُنھوں نے آنحضرتؐ سے عرض کیا کہ میں اسکو صدقہ کرنا چاہتا ہوں جسطرح حکم ہو عمل کروں۔ سرورِ عالم نے فرمایا: ان شئت حبست اصلها وتصدقت بها۔ اگر تمھاری خواہش ہو تو اس مال کو روک لو اور اسکو صدقہ کردو

ائمہ ستہ حدیث کے متفق علیہ الفاظ روایت کے یہی ہیں۔ ان سے واضح طور پر یہی سمجھ میں آتا ہے کہ حضورؐ کا فرمان یہ تھا کہ نخلستان کو اپنی ہی ملکیت میں روکے رکھو اور اس کے پھل کو صدقہ کردو، کیونکہ اس وقت "حبس" یا "وقف" کا لفظ ان اصطلاحی معنوں میں نہیں بولا جاتا تھا، جن میں بعد کے فقہاء ان کو استعمال کرنے لگے۔ غالباً امام ابوحنیفہ کا یہ خیال کہ مال موقوفہ واقف ہی کی ملکیت میں رہتا ہے۔ اسی روایت کی بنا پر تھا۔

بعد میں اس روایت پر اضافے ہوئے اور اسکے الفاظ میں تبدیلیاں کی گئیں۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ یہ [illegible] بنالی گئی جو فقہاء نے تجویز کیا تھا۔ حالانکہ ایسی روایتیں بھی ہیں جو وقف کے خلاف ہیں۔

امام طحاوی نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ سورہ نساء میں فرائض میراث نازل ہوجانے کے بعد رسول اللہ نے حبس کی ممانعت فرمادی جو میں نے خود سُنی۔

ابن ابی شیبہ نے اپنی کتاب مصنف میں حضرت علیؓ کا قول نقل کیا ہے کہ وراثت سے کوئی چیز روکی نہیں جاسکتی، بجز اسلحہ اور سواری کے، یعنی جنگ کے ہتھیار یا سواریاں جو جہاد کے لئے دے دی جائیں، ان کے سوا اور کسی شے کا کسی مخصوص غرض کے لئے روکنا جائز نہیں ہے، وہ ورثہ میں تقسیم ہوگی۔

حضرت ابن عباسؓ کی روایت کا کوئی جواب نہیں دیا گیا ہے، لیکن حضرت علیؓ کے قول کے متعلق بعض فقیہوں نے کہا ہے کہ وہ حجت نہیں ہے اسلئے کہ ان کا عمل اسکے خلاف تھا، کیونکہ مصر میں انھوں نے اپنا ایک گھر اپنی اولاد کے لئے خود واقف کیا تھا۔ مگر مصر میں حضرت علیؓ کب گئے؟ وہاں کون سا مکان بنایا یا خرید کیا؟ اور وہ کونسی اولاد انکی وہاں تھی، جس کے لئے وقف کیا؟ ان میں سے کسی بات کا بھی جواب تاریخ سے نہیں ملتا۔

Marfat.com

التاریخ المستند

لمسند الامام احمد

(از مولانا تمنا عمادی پھلواری شریف)

حضرت مولانا تمنا عمادی مدظلہ کا یہ مضمون جس محنت وکاوش سے لکھا گیا ہے، اس کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں۔ جن کو ایسی ٹھوس اور عمیق علمی تحقیق کا موقع ملا ہے، مولانا نے پوری کوشش سے اس مقصد کو پورا کر دکھایا ہے۔ جسکو پورا کرنا "البیان" کا نصب العین ہے۔ محترم ناظرین اس میں عام لذت کا سامان نہ پائیں گے کیونکہ یہ ایک دوائے تلخ ہے، جو مواد فاسد کو باریک رگوں کے اندر سے نکالنے میں کام یاب ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ مولانا کی عمر وصحت میں برکت دیں اور انھیں اپنے دین کی خدمت کی توفیق سے بہرہ یاب رکھیں۔ ——— مدیر

حدیث کی بعض کتابیں متاخرین نے خود جمع کیں مگر ان کو اگلے بزرگوں میں سے کسی کے نام کے ساتھ منسوب کر دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ عوام تو عوام ہیں، بعض خواص بھی کچھ دنوں کے بعد اس نسبت سے دھوکا کھا گئے اور اس کتاب کو انھیں بزرگ کی تالیف سمجھنے لگے، جن کی طرف اسکی نسبت کر دی گئی تھی۔

حافظ ابن حجر نے تعجیل المنفعہ کے دیباچے میں لکھا ہے کہ محمد بن علی بن حمزہ الحسینی نے مسند امام شافعیؒ و مسند امام [illegible] کا ذکر اس طرح کیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان کتابوں کو ان بزرگوں کی خاص تالیف سمجھتے تھے۔ حالانکہ مسند شا[illegible] کو بعض نیشاپوریوں نے کتاب الام وغیرہ سے اور بعض حدیثیں ابو العباس الاصم سے لے کر جن کو وہ تنہا ربیع بن سلیمان روایت کرتے تھے۔ ایک مسند شافعی مرتب کر رکھی تھی۔

اسی طرح امام ابو حنیفہؒ کے تین سو برس بعد ابو محمد الحارثی نے امام ابو حنیفہ ہی کے خیوخ پر کچھ حدیثیں مرتب کر ایک مجموعہ تیار کیا اور اس کا نام مسند ابی حنیفہ رکھ دیا۔ اس کے بعد اسی میں سے مرفوع حدیثیں چنکر ابو بکر بن المقری ایک مختصر سی مسند ابی حنیفہ مرتب کی۔ پھر حافظ ابو الحسن ابن المظفر نے بھی ایک مسند ابی حنیفہ جمع کی اور سب سے [illegible] میں ابن خسرو نے ایک ضخیم مسند ابو حنیفہ لکھ ڈالی۔ جو اگلی کتابوں کی جامع ہے۔

تو جب ابن حمزۃ الحسینی جیسے محدث ورجال، جو ابن حجر سے بھی متقدم تھے، صرف نسبت کیوجہ سے دھوکے [illegible]

تو تا بدیگراں چہ رسد۔

مگر یہ جامعین مسند چونکہ امام شافعیؒ اور امام ابو حنیفہؒ سے بہت زیادہ متاخر تھے اور پھر انکی [illegible] کسی خاص اجتماعی سازش کے ماتحت نہ تھی بلکہ مختلف اصحاب کی الگ الگ کوششیں تھیں اور [illegible]

خاص اپنے ہی فرقے کی تائید میں تھی، جس کی وجہ سے دوسرے فرقہ والوں نے ان کتابوں کی نسبتوں کو صحیح ثابت نہ ہونے دیا اور خود اس فرقے کے ثقہ لوگوں نے بھی دوسروں کی تکذیب کی تائید کی، جیسا کہ ابن حجر نے خود اعتراف کیا کہ مسند شافعی امام شافعیؒ کی تالیف نہیں بلکہ ان کے بہت بعد بعض نیشاپوریوں نے اس کی تالیف کی۔

بخلاف مسند امام احمد کے کہ یہ ایک خاص اجتماعی سازش کے ماتحت جمع کی گئی اور اس کے جامعین کی غرض ہی یہی تھی کہ اسکو جس طرح بھی ہو، خاص امام احمد کی تالیف ثابت کرکے رہیں اور اس کا اہتمام امام احمد کی وفات کے کچھ بعد ہی سے نہیں بلکہ عجب کیا ہے کہ ان کی گوشہ نشینی کے وقت ہی سے اس کی تالیفی داغ بیل ڈال دیگئی ہو۔ واللہ اعلم بالصواب۔

مسند امام شافعی کے جامع کی غرض اس کتاب سے مسلک امام شافعی کی تائید تھی اور مسند امام ابی حنیفہ کے جامع کی غرض اس کتاب سے مذہب امام ابوحنیفہ کی تائید تھی، اس لئے ان میں سے ہر ایک میں اپنے اپنے رنگ کی حدیثیں جمع کی گئیں تھیں۔

مگر مسند احمد میں مسلک امام احمد کے موافق و مخالف ہر طرح کی رطب و یابس روایتیں جمع کردی گئی ہیں اور اتنا بڑا ذخیرہ جمع کردیا ہے کہ ہر فرقے کے موافق بھی کچھ حدیثیں اس میں ملتی ہیں اور مخالف بھی۔

مسند شافعی سے صرف شوافع ہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور مسند ابی حنیفہ سے صرف احناف ہی کام نکال سکتے ہیں۔ دوسرے فرقے والے ان کتابوں میں بہت کم مستفید ہوسکتے ہیں۔ مگر مسند احمد سے جس طرح حنابلہ مستفیض ہوتے ہیں، بلکہ اسی طرح شوافع و احناف و مالکیہ بھی۔ اور صوفیہ اور شیعہ کے لئے تو یہاں خزانے کا دروازہ کھلا ہوا ہے یہاں تک کہ زنادقہ و ملاحدہ بھی اس کی بارگاہ سے محروم نہیں جاسکتے۔ ؎ عزازیل گوید لصیبے برم۔

یہی وجہ ہے کہ مسند شافعی سے احناف کو اختلاف ہوسکتا ہے اور ہے۔ مسند ابی حنیفہ پر شوافع وغیرہم طعن کرسکتے اور کرتے ہیں، مگر مسند احمد کی پالایش سب کے سب کر رہے ہیں کیونکہ یہ مجموعہ کل حزب بما لدیھم فریقوں کی عجیب غریب تماشاگاہ ہے۔ مسند احمد میں چوں کہ ہر فرقے کے موافق بھی روایتیں ہیں اور مخالف بھی اس لئے ہر فرقہ اس کی بعض حدیثیں لینے کے لئے جس طرح ہاتھ بڑھاتا ہے اسی طرح بعض کی طرف سے ہاتھ کھینچ بھی لیتا ہے اس کے لئے بات یوں بنائی جانے لگی کہ اس میں کچھ تو حدیثیں خاص امام احمد کی ہیں وہ تو بالکل صحیح ہیں امام احمد کے صاحبزادے عبداللہ کے اضافے ہیں۔ ان میں کچھ ضعیف حدیثیں بھی ضرور ہیں اور کچھ حدیثیں عبداللہ بن احمد کے شاگرد ابوبکر قطیعی کی بڑھائی ہوئی ہیں، جن میں ضعیف ہی نہیں بلکہ کچھ موضوعات بھی ہیں اس کے بعد ہر فرقے کو اس کا موقع مل جاتا ہے کہ جو حدیث اس کے موافق اس ذخیرے میں ملتی ہے، اسکو خاص کرکے ہوا اس کو دانتوں سے پکڑ لیتا ہے اور جو حدیث اسکے مخالف ملتی ہے، اس کو عبداللہ کے زیادات یا

Marfat.com

ابوبکر قطیعی کے اضافے قرار دیکر رد کر دیتا ہے۔

رجال کی چھان بین کرنے والوں کی کافی تعداد دوسری صدی کے اواخر ہی سے پیدا ہو چکی تھی اور یہ فن روز افز
ترقی پر مدتوں رہا۔ مگر باوجود کافی تفحص اور قابلِ رشک دیانتداری کے نفسانی رجحانات سے ائمہ رجال بھی محفوظ نہ رہ
سکے، اور جس طرح امام مالک و امام احمد اور بخاری و مسلم کے خیوخ سے جہاں تک ہو سکا، چشم پوشی سے کام لیا گیا، اسی
طرح ایسے لوگوں کے متعلق بھی عفو و درگزر سے حتی الوسع کام لیا گیا، جن سے روایات کا کوئی خاص مقصد وابستہ تھا مثلاً
حفص و حمزہ زیات وغیرہما جیسوں کے احکام و سنن کی کبھی کوئی روایت معتبر نہیں سمجھی گئی، مگر اختلاف قرأت کی روایتیں
ضرورتاً ان سے لے لی گئیں ورنہ وہ قرأتیں جو اُن سے مروی ہیں معدوم ہو جاتیں اور ان کے معدوم ہونے سے قاریوں
کے نزدیک قرآن کا ایک حصّہ ہی معدوم ہو جاتا۔

اسی طرح سُدّی و کلبی وغیرہما کہ ہرچند احکام و سنن میں ان جیسوں کی کوئی روایت مقبول نہیں ہوئی، کیونکہ یہ لوگ
بالاتفاق وضّاع و کذّاب ہیں، مگر تفسیری روایتیں کم سے کم پچانوے فیصدی اُن جیسوں سے مروی ہیں اگر ان لوگوں کو
نامعتبر قرار دے کر انکی تفسیری روایتیں رد کر دی جائیں تو پھر یہ تفسیر کا ذخیرہ تو بالکل غائب ہی ہو جائے گا۔

بالکل اسی طرح مسند کے دو راوی ابوبکر قطیعی جو مسند کی روایت عبداللہ بن امام احمد سے تنہا کر رہے ہیں
ابن المذہب جو ابوبکر قطیعی سے تنہا مسند کی روایت کرتے ہیں۔ اگرچہ یہ دونوں غیر مُتّہم اور حقیقتہً ناقابلِ اعتبار
مگر ان کو ناقابل اعتبار قرار دے کر ان کے واسطے سے جو مسند احمد کا ذخیرہ مل رہا ہے، اس کو غیر مستند سمجھتے ہوئے
رد کر دیتے تو پھر ایسی نعمتِ عظمیٰ جس سے ہر فرقہ کا کام نکل رہا ہو، کہاں ملتی؟ اس لئے جس طرح قرأت کے لئے حفص
و حمزہ کو گلے لگانا پڑا اور تفسیری روایتوں کی خاطر سدی و کلبی کے سامنے زانوئے ادب تہ کرنے کو گوارا کیا گیا اسی
مسند احمد کی ضرورت نے ابوبکر قطیعی و ابن المذہب کی پالائش کرنے پر محدثین و ائمہ رجال کو مجبور کیا۔

متقدمین نے تو اتنا بھی اعتراف کیا تھا کہ اس انبار روایات میں بعض موضوع روایتیں بھی ہیں مگر وہ صر
ابوبکر قطیعی کے اضافے والی روایتیں ہیں۔ چنانچہ ابن جوزی[1] و علامہ عراقی[2] نے مثالاً بعض روایتوں کو موضوع قرار د
پیش بھی کیا تھا۔ مگر بعد والے اس مسند کے ساتھ اس قدر غلو پیدا کر چکے تھے کہ اسکو بھی برداشت نہ کر سکے کہ ابوبک
ہی پر الزام رکھتے ہوئے سہی، اس کتاب میں کسی موضوع حدیث کا وجود بھی تسلیم کیا جائے، چنانچہ حافظ ابن ح

---

[1] ابوالفرج عبدالرحمٰن بن علی الجوزی۔ ولادت ۵۰۸ھ سے ۵۱۰ھ تک کے اندر، وفات ۵۹۷ھ۔

[2] حافظ زین الدین عبدالرحیم بن الحسین العراقی۔ ولادت ۷۲۵ھ۔ وفات بروایات صحیحہ ۸۰۶ھ ان کی کتاب

"الحدیث" مشہور و معروف ہے۔

متوفی ۸۵۲ھ جو خود اپنی کتاب لسان المیزان ج ۲ ص۱۳۷ میں ابن المذہب ہی کے ترجمے کے آخر میں ابن المذہب اور ان کے شیخ ابوبکر قطیعی دونوں کو غیر متقن قرار دیتے ہوئے امام ذہبی کا قول نقل کر رہے ہیں کہ "اسی لئے مسند احمد میں ایسی ایسی چیزیں واقع ہوگئیں، جن کی نہ تو متن ہی محکم ہے، نہ اسناد ہی"۔ انھیں ابن حجر نے ابن جوزی عراقی کے جواب اور مسند احمد کی حمایت میں ایک کتاب ہی لکھ ڈالی، جس کا نام القول المسدد فی الذب عن مسند احمد ہے، اس میں اُن تمام حدیثوں کو جنھیں ان دونوں میں سے کسی ایک نے بھی موضوع قرار دیا تھا، صحیح ہی نہیں بلکہ بعض کو تو متواتر یا قریب متواتر تک بزعم خود ثابت کر دکھایا ہے۔

اخی المکرم مولانا عبید اللہ الاعظمی مدرس سینیئر مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے بسلسلہ تذکرہ ابن حجر کی اس بے جا حمایت کا ذکر آیا تو انھوں نے مجھ سے کہا کہ "آپ ان میں کسی ایک حدیث کو بھی اب پھر کوشش کر کے موضوع ثابت کر دیجئے اور ابن حجر کے دلائل کو باطل کر دکھائیے تو میں جانوں"۔ میں نے ان کی خدمت میں عرض کیا کہ "آپ ہی ان میں سے کسی حدیث کو چن دیجئے"۔ بھائی صاحب مرحوم و مغفور نے سُدّ وا ابواب المسجد الا باب علی والی حدیث پیش کی کہ "اس کو ابن جوزی و عراقی دونوں ہی نے موضوع قرار دیا ہے اور ابن حجر نے اس کی تصحیح کرتے ہوئے اس کو قریب بتواتر دلائل قاطعہ و براہین ساطعہ سے ثابت کر دکھایا ہے۔ آپ ابن حجر کے دلائل کو غلط ثابت کر کے اس حدیث کو واقعی موضوع اور حقیقتاً شیعوں کا افترا ثابت کر دکھائیے"۔ بتوفیقہ تعالیٰ ہفتہ کے اندر خود ابن حجر ہی کی کتابوں سے ابن حجر کے اقوال و دلائل کی دھجیاں اڑا کر رکھ دیں اور [illegible] حدیث درحقیقت موضوع ہی ہے۔ بھائی صاحب ممدوح میرے مختصر رسالے کو دیکھ کر بہت خوش [illegible] داد دی اور ابن حجر کی اس بے جا حمایت پر سخت متاسف ہوئے۔ رحمہم اللہ تعالیٰ وعفا عنہم۔

اسناد مسند احمد۔ اس مسند کے اسناد جہاں کہیں ملتے ہیں، اسی سلسلہ روایت سے ملتے ہیں کہ صرف عبد اللہ بن احمد الرصافی ہی سے دوسرے مختلف لوگ روایت کرتے ہیں اور عبد اللہ بن احمد الرصافی تنہا اسکی روایت شیخ ابو القاسم ہبۃ اللہ بن محمد بن عبد الواحد[1] ابن احمد بن الحسین الشیبانی سے کرتے ہیں اور وہ تنہا ابو علی الحسن بن علی بن محمد التمیمی الواعظ عن ابن المذہب سے وہ تنہا ابو بکر احمد بن جعفر بن حمدان بن مالک القطیعی سے۔ وہ تنہا عبد اللہ بن الامام احمد سے۔ وہ تنہا اپنے والد ماجد امام احمد بن محمد بن حنبل سے۔

مسند احمد کے تمام قدیم و جدید، قلمی و مطبوعہ نسخوں کو دیکھ لیجئے بسم اللہ کے بعد ہی اسکا آغاز اخبرنا سے ہوتا ہے یہ اخبرنا کہنے والے کون ہیں، اللہ ہی کو معلوم۔ ممکن ہے کہ اس جمع یا تثنیہ متکلم میں حنبل بن عبد اللہ الرصافی بھی ہوں

---

[1] مسند کے موجودہ مطبوعہ مصری نسخے میں یہاں پر عبد الواحد کی جگہ عبد الوہاب لکھا ہوا ہے مگر جہاں تک میں نے تحقیق کی صحیح عبد الواحد ہی ہے واللہ اعلم

Marfat.com

مگر حنبل بن عبداللہ الرصافی اور ابوالقاسم ہبتہ اللہ کا حال مجھ کو باوجود جستجو کے رجال کی کسی کتاب میں کہیں نہیں ملا۔ ہے کہ طبقات الحنابلہ وغیرہ میں کہیں مذکور ہوں، مگر اتنا ضرور ہے کہ حنبل بن عبداللہ اور ابوالقاسم ہبتہ اللہ ان دونوں کے نام صرف اسی مسند ہی کے سلسلۂ اسناد میں آتے ہیں۔ اس کے سوا اور کہیں بھی دیکھنے میں نہیں آتے۔ وفیہ ما فیہ۔

بہرکیف ان کے بعد ابن المذہب ہی کا نام آتا ہے تو اب ابن المذہب کا حال سنئے۔

ابن المذہب۔ ابوالقاسم ہبتہ اللہ کے شیخ ابن المذہب یعنی الحسن بن علی بن محمد ابوعلی بن المذہب الوا التمیمی البغدادی۔ ابوالقاسم ہبتہ اللہ کی طرح یہ واحد راوی اس پورے ذخیرۂ روایات یعنی مکمل مسند احمد کے ہیں۔ یہی اس مسند کی روایت ابوبکر قطیعی سے کرتے ہیں اور ابوبکر قطیعی، عبداللہ سے، وہ اپنے والد امام احمد سے۔

امام ذہبی میزان الاعتدال میں اور ابن حجر لسان المیزان میں ان کا مفصل حال لکھتے ہیں۔ دونوں ہی ان متعلق خطیب بغدادی کا قول نقل کرتے ہیں کہ "ابن المذہب کا ابوبکر قطیعی سے مسند احمد کا سننا تو صحیح[1] ہے مگر پورا کا نہیں۔ بعض اجزاء کا سننا ثابت نہیں، مگر ابن المذہب نے اُن غیر مسموعہ اجزا کو بھی مسموعہ کے ساتھ ملا لیا تھا اور کی کتاب الزہد کو دیکھ کر اس کی بھی روایت کرنے لگے، حالانکہ اس کا اصل نسخہ ان کے پاس نہ تھا۔ خود اپنے ہی کے لکھے ہوئے نسخے سے روایت کیا کرتے تھے۔ اس لئے وہ محلِ حجت نہیں"۔

ذہبی و ابن حجر لکھتے ہیں کہ "ابن المذہب ۳۵۵ھ میں پیدا ہوئے اور نواسی سال کی عمر پاکر ۴۴۴ھ میں وفات پا مسند فضالہ بن عیاض اور مسند عوف بن مالک، ابن المذہب کے نسخۂ مسند میں نہ تھے۔ اسی طرح مسند جابر کی وہ بعض بھی نہ تھیں، جن کو حُرّانی نے قطیعی سے روایت کیا ہے"۔

پھر حافظ ابن حجر، امام ذہبی کا معترفانہ اعتراض نقل کرتے ہیں کہ "جب ایک شخص بقول خطیب کسی کتاب کی روا کے سلسلے میں اپنا نام جوڑ سکتا ہے، تو یہ جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے، یعنی مسند فضالہ و مسند عوف اور مسند جابر میں کی چیز احادیث کا الحاق بھی (اپنی طرف سے) کر لیا ہوگا"۔

---

[1] اگر ذہبی و ابن حجر اتنا نہ لکھیں اور اس سماعت کی صحت تسلیم نہ کریں تو پھر مسند احمد کا وجود ہی غائب ہو جاتا ہے، اسلئے اتنا ا مجبوراً ضروری تھا۔ اس کے بعد "مگر پوری کتاب کا نہیں" یہ فقرہ بے بوٹی دھج گوئی ثابت کرنے کے لئے لکھ دینا لازمی تھا۔

[2] اس کا اصل نسخہ دنیا میں کہیں نہ تھا۔ یہ پوری کتاب مجرد ابن المذہب اور ان کے رفقاء کی تصنیف کردہ تھی، جس کو اپنے ہاتھ سے لکھ کر امام احمد کی طرف منسوب کر رکھا تھا۔ ابن حجر فرماتے ہیں "اس لئے وہ محلِ حجت نہیں" تو پھر اور کس کی روایت زہد محل حجت ہو سکے گی؟ دنیا میں ہے کوئی؟ جو ابن المذہب کے علاوہ کسی اور کی روایت سے کتاب الزہد کو پیش کر سکے۔

[3] حرّانی سے مراد ابوشعیب عبداللہ بن الحسن حرّانی کے سوا اور کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ خود ابن حجر و ذہبی کی تصریحات اور نہ کوئی دوسرا اس کا لقب ایسا ہے، جسکو کہا جا سکے کہ شاید وہ ہو۔ تفصیل دیکھئے۔

Marfat.com

اتنا لکھ کر پھر حافظ ابن حجرؒ امام ذہبی کا یہ قول بھی نقل کرتے ہیں کہ "شجاع دہلی نے کہا ہے کہ ابن المذہب روایتوں میں معتمد علیہ نہ تھے۔ سلفی نے کہا یہ ہمیشہ محلِ گفت گو رہے۔ کتاب الزہد کے معدوم[1] ہو جانے کے بعد بغیر اصل کتاب کے خود اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے نسخہ کتاب الزہد کی روایات کیا کرتے تھے۔ خطیب نے کہا کہ ابن المذہب نے ایک ایسی حدیث ابوبکر قطیعی سے روایت کی، جس کو اُن سے ہرگز نہیں سنا تھا۔"

اس پر ذہبی نے ابن المذہب کی طرف سے یہ تاویل کی ہے کہ شاید وجادۃً اجازت بنالی ہو (یعنی وہ حدیث کہیں قطیعی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی دیکھی ہو، یا کسی اور جگہ قطیعی کی طرف منسوب نظر آئی ہو اور انھوں نے اسی پا لینے کو اجازت قرار دے دی ہو اور حدثنا ابوبکر قطیعی کہہ کر روایت کرنے لگے ہوں، تو کیا یہ بھی جھوٹ نہ ہوا؟

پھر ابن حجر لکھتے ہیں "خطیب بغدادی نے یہ بھی بیان کیا کہ ابن المذہب نے ہم لوگوں سے بواسطۂ دارقطنی و ورّاق وابوعمرو بن مہدی ایک مرتبہ ایک حدیث محاملی سے روایت کی، تو میں نے کہا کہ یہ حدیث تو ابوعمرو بن مہدی کے پاس نہ تھی۔ تو ابن مذہب نے ابن مہدی کے نام پہ ہاتھ مار کر کہا کہ بہتیری حدیثیں میرے سامنے پیش کی جاتی ہیں جن میں نام غیر منسوب ہوتے ہیں تو میں اُن کو اپنی طرف سے منسوب کر لیا کرتا ہوں، اس طرح اصل روایت میں وہ نسبت ملحق ہو جایا کرتی ہے۔"

اتنا لکھ کر ابن حجر لکھتے ہیں کہ "ابن مذہب کے ہمعصر انکی ان حرکتوں کو بہت ناپسند کرتے تھے مگر یہ کبھی ان حرکتوں سے باز نہ آئے۔"[2]

ان تمام باتوں کو لکھ کر اخیر میں حافظ ابن حجر پھر ذہبی کا آخری قول نقل فرماتے ہیں کہ "ان تمام باتوں سے یہ ظاہر ہو گیا کہ ابن المذہب ایک غیر متقن آدمی تھے اور انھیں کی طرح انکے شیخ (ابوبکر قطیعی) بھی۔ اور اسی وجہ سے [illegible] ایسی ایسی چیزیں واقع ہو گئیں، جن کی نہ تو متن محکم ہے نہ اسناد ہی۔ واللہ اعلم۔" (دیکھئے لسان المیزان جلد ۲ صفحہ [illegible] میزان الاعتدال جلد اول صفحہ ۲۲۷)

یہی ابن المذہب ہیں جو ابن مالک ابوبکر القطیعی سے مسند احمد کے تنہا راوی ہیں۔ ان کے سوا کوئی دوسرا راوی مسند

---

[1] کتاب الزہد کا وجود ہی پہلے کہاں تھا کہ معدوم ہوتی؟ اس کو تو نہاں خانۂ عدم سے ساحت وجود پر غریب ابن المذہب ہی پہلے پہل لائے اگر کسی نے نام سے پیش کرتا تو مانتا ہی کون؟ اسلئے بیچارے نے اسکو امام احمد کی طرف منسوب کر دیا:۔ اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا۔ ورنہ امام احمد کے شاگرد اس تصنیف سے انکے تلامذہ نے ایسی بے اعتنائی کیوں برتی؟ اور یہ چیز معدوم کیوں اور کس طرح ہو گئی۔

[2] یہی وجہ ہے کہ باوجود اسکے کہ ابن المذہب مسند احمد اور کتاب الزہد کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کے پھرے، مگر بجز ابوالقاسم ہبۃ اللہ کے انکو اور کوئی ایسا نہ ملا جو انسے مسند احمد یا کتاب الزہد کی سند لیتا۔ بادی النظر میں جس نے بھی اُلٹ پلٹ کر دیکھا، چیز اچھی نظر آئی، اس لئے امام احمد کی نسبت کا اتنا ہی اہتمام کیا تو بات کو زبان سے جھٹلایا نہیں، مگر ہر شخص دل میں ضرور ان کتابوں کی طرف سے غیر مطمئن رہا ورنہ کچھ بھی وثوق اگر ہوتا تو خود خطیب بغدادی اور انکے دوسرے معاصر مسند احمد اور کتاب الزہد کا سماع ابن مذہب سے ضرور لیتے۔ امام احمد کی کتابیں ایسی نہیں ہو سکتیں کہ خطیب جیسے محدثوں کے رسیا انکی طرف سے بے اعتنائی ایسے پہلو اختیار کریں۔

Marfat.com

احمد کا دنیا میں پیدا نہیں ہوا۔ اور یہ بھی تنہا جو روایت کرتے ہیں تو صرف ابن مالک ابوبکر قطیعی ہی سے۔ امام ذہبی نے میزان الاعتدال میں اور ابن حجر نے لسان المیزان میں جو اتنا بھران کے متعلق لکھا ہے، وہ بھی مجبوراً۔ اس لئے کہ کہاں تک چھپاتے اور اگر ان کے تمام حالات واضح کر دیتے تو پھر مسند احمد کی کوئی حیثیت باقی نہ رہتی۔

ابھی ابھی ابن المذہب کے آغاز تذکرہ میں آپ نے پڑھا کہ "ابن المذہب کے نسخہ مسند احمد میں مسند جابر کی بعض حدیثیں نہ تھیں جن کو حرّانی نے قطیعی سے روایت کیا ہے"۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابوبکر قطیعی سے حرّانی (یعنی ابوشعیب عبداللہ بن الحسن الحرانی) نے بھی مسند احمد کی روایت کی ہے، تو قطیعی سے مسند احمد کے تنہا راوی ابن المذہب نہ ہوئے بلکہ دوسرے راوی حرّانی بھی ہیں[۵۱]۔ مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ اس طرح کی داؤ گھات چالاک محدثین کو خوب آتی ہے کہ بعض غلط باتیں ضمنی طور سے کسی دوسرے تذکرے میں کہہ جاتے ہیں، تاکہ خارج از مبحث بات ہونے کی وجہ سے اس غلط بات کی تغلیط کی طرف کوئی توجہ نہ کرے اور اس طرح وہی غلط بات آئندہ کے لئے صحیح بن جائے۔ بعد کو جب یہی بات جو اس وقت خارج از مبحث ہے، خود موضوع بحث بنائی جائے گی، تو یہ تحریر اسوقت ثبوت میں پیش کر دی جائے گی کہ فلاں جگہ اس کا ذکر آچکا ہے۔ اگر یہ بات غلط ہوتی تو اسی وقت اس کی تردید کی جاتی۔

حقیقت یہ ہے کہ حرّانی کا ابوبکر قطیعی سے پوری مسند احمد یا اس کے کسی جز کا بھی بلکہ کسی ایک حدیث کا بھی روایت کرنا کسی کتاب سے ثابت نہیں۔ خود ابن حجر لسان المیزان جلد ۲ صفحہ ۲۷۹ میں حرّانی کا ترجمہ لکھتے ہیں، مگر ان کے شیوخ میں ابوبکر قطیعی کا نام نہیں لکھتے اور نہ مسند احمد ہی کی روایت کا ذکر کرتے ہیں اور اس کی اُمید بھی نہیں کی جا سکتی کہ ایک قطیعی نوّے برس کا بوڑھا[۵۲] آدمی ایک بائیس برس کے چھوکرے سے مسند احمد کی سماعت کرنے جائے دو چار حدیثیں نہیں بلکہ تقریباً ہزار حدیثیں۔ اگر کہا جائے کہ جس سال حرّانی جنت کو سدھارے، اسی سال نہیں، بلکہ اس سے چند سال پیشتر ان کی اتنی عمر شاید ہو گئی ہو، تو چند سال پیشتر تو قطیعی صاحب اور بھی زیادہ ہی کم سن اور نوعمر ہوں اور پھر حرّانی نے تو عبداللہ بن احمد کا

---

[۵۱] تعجب ہے کہ امام ذہبی اور ابن حجر دونوں ہی ابن المذہب کو مسند احمد کا ابوبکر قطیعی سے تنہا راوی بھی لکھتے ہیں، پھر حرانی کو بھی قطیعی سے احمد کا راوی بتاتے ہیں۔ اگر دونوں قطیعی سے مسند کی روایت کرتے تھے تو پھر ابن المذہب تنہا راوی کس طرح ہوئے۔

[۵۲] ابوشعیب الحرانی کے متعلق ابن حجر لسان المیزان میں لکھتے ہیں کہ یہ ۱۵۶ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۹۵ھ میں ۸۹ برس کی عمر پاکر وفات ظاہر ہے کہ اس حساب سے ان کی عمر ۸۹ برس کی نہیں ہوتی بلکہ اس حساب سے ان کی عمر ۱۳۹ سال کی ہو جاتی ہے۔ ابن حجر یہ بھی لکھتے ہیں کہ احمد کا قول ہے کہ حرانی نے ۲۹۲ھ میں وفات پائی۔ اس لئے یقیناً سال ولادت ہی غلط ہے۔ غالباً ۱۵۶ھ یا ۱۵۶ھ میں حرانی کی ولادت ہی ۸۹ سال کی عمر پاکر ۲۹۲ھ یا ۲۹۵ھ میں ان کی وفات ہوئی۔ مگر بہرحال یہ عبداللہ بن احمد سے عمر میں بڑے تھے اور خاص امام احمد کی روایت کر سکتے تھے اور اگر امام احمد یا عبداللہ کے وقت میں مسند کا وجود ہوتا، تو قطیعی تو کیا حرانی سے بھی زیادہ معتمد علیہ محدثین سے امام احمد اور نیز عبداللہ سے کرنے والے دنیا میں مشہور و معروف ہوتے۔

Marfat.com

قطیعی سے کہیں زیادہ پایا، بلکہ خاص امام احمد یا عبداللہ ہی سے مسند احمد کی سند لینے میں کیا دشواری تھی جو ایک کم سن چھوکرے غیر متقن سے مسند کی سند لیتے؟

مگر ابوبکر قطیعی تو حرانی کی وفات کے وقت زیادہ سے زیادہ بائیس ہی سال کے ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ قطیعی کی ولادت ۲۷۲ھ کی ہے، جیسا کہ آگے آتا ہے، تو اگر خود قطیعی حرانی سے کچھ حدیثیں روایت کرتے، جب بھی شبہ ہوتا کہ انھوں[۵۱] نے تو حرانی کے اختلاط حواس کا زمانہ دیکھا، ان کی سماع صحیح ہے یا نہیں۔ نہ کہ یہ کہا جا رہا ہے کہ حرانی نے اس کبرسنی میں ایک نوجوان سے دو چار حدیث نہیں بلکہ ساٹھ ہزار حدیثوں کا مجموعہ جا کر اول سے آخر تک سنا، یا سنایا، اور بالفرض اگر ایسا تھا تو پھر حرانی کے ترجمے میں ابن حجر یا امام ذہبی نے یہ کیوں نہیں لکھا کہ انھوں نے قطیعی سے مسند احمد کی اس بڑھاپے میں سندلی یا یہ قطیعی سے مسند کی روایت کرتے ہیں۔ پھر ابن سمعانی نے بھی اپنی کتاب الانساب میں حرانی کا ترجمہ لکھا ہے، وہ بھی یہ نہیں لکھتے کہ مسند احمد کی یہ قطیعی یا کسی سے بھی روایت کرتے ہیں یا قطیعی سے کوئی بھی حدیث سنی۔ غرض حرانی کا مسند احمد سے دراصل کوئی واسطہ نہیں ہے اور یہ مسند احمد سے بالکل اسی طرح بے خبر ہیں، جس طرح دوسرے محدثین جو قطیعی سے متقدم تھے، سند سے بے خبر تھے، اس لئے کہ قطیعی کی ولادت سے پہلے مسند احمد کا دنیا میں کہیں نام و نشان بھی نہ تھا۔

ابوبکر قطیعی۔ احمد بن جعفر بن حمدان بن مالک بن شعیب ابوبکر القطیعی ۲۷۳ھ میں پیدا ہوئے اور ۳۶۸ھ میں وفات پائی چوں کہ یہی مسند احمد کے تنہا راوی ہیں، اس لئے اگر ان کی توثیق نہ کی جاتی تو پھر یہ ذخیرہ روایات کہیں کا بھی نہ رہتا۔ اسی لئے امام ذہبی نے میزان الاعتدال جلد اول ص۲۱ میں انکے ترجمے کے ضمن میں اتنا تو اعتراف کیا ہے کہ "ابن الفوارس ان کو حدیث میں کچھ یونہی سا سمجھتے تھے اور مسند احمد کے بارے میں ان کے بعض[۵۲] اصول قبل نظر ہیں" دارقطنی نے کہا کہ ان کی کتاب کا کچھ حصہ غرق ہو گیا تھا، تو ایک دوسری[۵۳] کتاب جس کے متعلق ان کی سماع نہ تھی، اس سے

---

[۵۱] ابن الذہب کے ترجمے میں ابن حجر لسان المیزان جلد ۲ ص۱۰۲ میں ایک موقع پر لکھتے ہیں کہ ابن الذہب نے (ایک روایت میں قطیعی کے ساتھ ابوعبدالحوفی کا نام بھی لگا کر کہا ہے کہ ان دونوں نے کہا کہ ہم سے ابوشعیب حرانی نے حدیث بیان کی اھ" اس سے اتنا معلوم ہو گیا کہ قطیعی نے خود حرانی سے حدیث سنی اور روایت لی ہے نہ کہ بالعکس۔

[۵۲] امام ذہبی ہوں یا ابن حجر مسند کے ہر راوی کو بہ حال ہو قرار دیتے جانتے ہیں اسلئے انکے خاص [illegible] اور جرح بھی [illegible] ہوئے سند پر بھی وقت آ جاتی ہے تو [illegible] اتنا تو ہو کہ سند بالکل سر سے پیر تک شبہ نہ ہو جائے [illegible] بہرحال نظر پورا سند نہ ٹھہر جائے، حالانکہ ابن الفوارس پورے سند کو قبل نظر ٹھہراتے ہیں۔

[۵۳] وہ دوسری کتاب کس کے پاس تھی؟ اور جس کے پاس تھی، اس نے کہاں سے حاصل کی تھی؟ اور پھر وہاں صرف ابوبکر قطیعی کو اپنی کتاب سے [illegible] اور کسی کو ان سے سند کی اجازت یا نقل کا موقع کیوں نہ ملا؟ اور پھر اس شخص نے خود سند کی روایت کیوں کی؟ اور عبداللہ ابن احمد سے اس کو وہ کتاب [illegible] تنہا عبداللہ سے سند کے راوی نہ ہوئے وہ بھی تو ایک ہوا اور اگر اسکو خود امام احمد سے سند مل تھی۔ جب تو بڑی چیز ہوئی۔

Marfat.com

انھوں نے حدیثیں نقل کرلیں، اس وجہ[1] سے محدثین کی ان پر چشمکیں تھیں۔" اتنا لکھ کر امام ذہبی لکھتے ہیں کہ "ورنہ (یعنی اگر یہ سب باتیں نہ ہوتیں، تو) وہ فی نفسہ ثقہ ہیں" پھر خود لکھتے ہیں کہ "میں خود ان سے سخت متنفر اور بیحد خفا تھا مگر معلوم ہوگیا کہ نہیں یہ سچے آدمی ہیں، انکی سماع میں شک نہیں کیا جاسکتا اور میں نے سنا ہے کہ وہ مجاب الدعوۃ بھی تھے۔" ان توثیق کی اتنی کوشش صرف مسند احمد کا بھرم رکھنے کے لیے ہے، چنانچہ ابن حجر، امام ذہبی کی اتنی عبارت نقل کرکے لسان المیزان جلد ۱ ص۲۵۱ میں لکھتے ہیں کہ "ذہبی نے جو ابن فرات (کی جرح) پر انکار کیا ہے، اس سے تعجب ہے، کیونکہ ابن فرات ہی کچھ اس (جرح) میں متفرد نہیں ہیں، بلکہ خطیب نے بھی اس کو احمد بن احمد المسیبی کے ترجمے میں لکھا ہے۔ پھر آگے چل کر ابن حجر لکھتے ہیں کہ" اور ذہبی سے تعجب ہے کہ ابن الفرات کے قول کی تو (یہاں) تردید کرتے ہیں مگر (انھیں قطیعی کے شاگرد خاص) حسن بن علی التمیمی (ابن المذہب) کے ترجمے کے آخر میں خود لکھتے ہیں (یعنی وہ جو ہم نے ابن المذہب کے ترجمے میں لکھا ہے کہ ابن حجر نے ابن المذہب کے متعلق امام ذہبی کا قول نقل کیا ہے) کہ یہ بات[2] ظاہر ہے کہ ابن المذہب ایک غیر متقن شیخ تھے، اور انھیں کی طرح اُن کے شیخ ابن مالک (القطیعی) بھی اور اس وجہ سے مسند امام احمد میں ایسی چیزیں واقع ہوگئی ہیں، جن کی نہ متن ہی درست ہے نہ اسناد ہی واللہ اعلم۔"

غرض ذہبی اور ذہبی سے زیادہ ابن حجر، قطیعی سے بالکل مطمئن نہیں ہیں، مگر دونوں ہی مسند کی وجہ سے مجبور ہیں اس لئے باوجود دلی تنفر کے کسی نہ کسی حد تک قطیعی کی توثیق ضرور کئے جاتے ہیں تاکہ مسند احمد کا بھرم رہ جائے۔ اگر مسند کا خیال نہ ہوتا، تو خدا جانے یہ لوگ قطیعی اور ابن المذہب دونوں کے متعلق کیا کیا لکھتے۔

قطیعی کے شیوخ دراصل قطیعی کے شیوخ نہ تھے

قطیعی کے شیوخ میں عبداللہ بن احمد کے سوا تین چار اور نام بھی ائمہ رجال نے لکھے ہیں جن میں اکثریت وضاعین کذابین کی ہے۔ مثلاً محمد بن یونس السامی الکدایمی وغیرہ۔ مگر تعجب یہ ہے کہ جہاں ان لوگوں کے تلامذہ کی فہرست ہے

---

[1] محدثین کی چشمکیں تو دراصل اس مسند احمد کے اختراع و اختلاق ہی کی وجہ سے تھیں، مگر برقانی نے پردہ ڈالنے کیلئے کچھ حصہ کتاب کے غرق ہوجانے کو چشمک کا سبب قرار دے دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کے معاصرین نے ان سے مسند احمد کے اصل نسخہ کا مطالبہ کیا، تو انھوں نے کہا وہ فلاں سفر میں غرق ہوگئی میں نے اپنی یادسے اور کچھ ردی پرزے پر جو مسودہ تھا، اس سے مرتب کرلیا، اسی لئے انکے معاصرین نے اس مسند کو مشکوک قرار دیا اور ان پر چشمکیں اتنے بڑے اہم واقعہ کو برقانی نے کس قدر ہلکا کرکے دکھایا، صرف مسند احمد کا بھرم رکھنے کے لئے۔

[2] کس ذریعے سے معلوم ہوا؟ اسکے ذکر کی ضرورت نہ تھی، مگر مجھ کو وہ ذریعہ معلوم ہے، یعنی یہی کہ دوسرے ہم عصر محدثین نے کہا کہ اگر ان کو معتبر نہیں مان لیتے ہیں، تو پھر مسند احمد جیسا ذخیرۂ روایات ہاتھ سے جاتا ہے اسلئے جسطرح ہم لوگوں نے انکی سماع صحیح مان لی ہے آپ بھی ان کو معتبر اور خفگی کو دور کیجئے اور پھر مسند کے پروپاگنڈا کرنے والوں نے قطیعی کے ولی اور مجاب الدعوات ہونے کا بھی پروپاگنڈا کر رکھا تھا۔

[3] میزان الاعتدال جلد ۱ ص۲۲۷۔

Marfat.com

قطیعی کا کوئی ذکر نہیں اور نہ قطیعی کی اتنی عمر ہو سکتی ہے کہ ان لوگوں سے یہ حدیثیں سنیں، اور روایتیں اخذ کر سکیں۔ البتہ قطیعی کے حقیقی استاد اور رفیقِ مذہب و مسلک ابوبکر شافعی کا نام ان لوگوں کے تلامذہ میں آتا ہے۔ جس طرح عبداللہ بن احمد کے ساتھ بھی دراصل ابوبکر شافعی ہی رہے اور ان کے ساتھ بچوں کے طرح یہ قطیعی صاحب بھی لگے لپٹے رہتے تھے۔ ان کو جو کچھ بھی ملا۔ ابوبکر شافعی ہی سے ملا، مگر یہ درمیان سے ابوبکر شافعی کا نام اڑا کر اپنی نسبت کو بلاواسطہ ابوبکر شافعی کے شیوخ سے جوڑ دیا کرتے تھے، اسی لئے ان کے اکثر شیوخ ایسے ہیں، جو ان کی کمسنی یا کم شباب ہی کے وقت دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ غرض یہ خوب سمجھ لینا چاہیے کہ دراصل قطیعی کے استاد و شیخ جو کچھ بھی تھے، صرف ابوبکر شافعی ہی تھے اور کوئی بھی نہیں۔ نہ عبداللہ بن احمد، نہ کوئی اور، جس کی تصریح آگے ابوبکر شافعی کے ترجمے میں آتی ہے۔ سلسلہ قائم رکھنے کے لئے ابھی عبداللہ کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیے۔

عبداللہ بن امام احمد بن حنبل۔ ان کی ولادت ۲۱۳ھ کی ہے اور ۲۹۰ھ میں انھوں نے وفات پائی۔ حضرت امام احمد کی وفات ۲۴۱ھ میں ۱۲ ربیع الاول کو ہے، یعنی تقریباً آغاز سال ہی میں، اور عبداللہ کی پیدائش ۲۱۳ھ کے وسط میں ہے، اس لئے امام احمد کی وفات کے وقت عبداللہ زیادہ سے زیادہ ۲۷ برس کے تھے۔

اور ابوبکر قطیعی کی عمر عبداللہ کی وفات کے وقت زیادہ سے زیادہ ۱۷ سال کی ٹھہرتی ہے، اسی لئے اس قدر پتہ چل سکتا ہے کہ یہ چند سال عبداللہ بن امام احمد کی خدمت میں شاید رہے ہوں، مگر اس عمر میں ساٹھ ہزار حدیثوں کا سن لینا، سننا اور اخذ کرنا بالکل خلاف عقل ہے۔ کوئی صاحب انصاف اس کو تسلیم نہیں کر سکتا۔

قطیعی دراصل ابوبکر شامی کے چیلے تھے

البتہ یہ بچپن ہی سے ابوبکر شافعی کے ساتھ لگے رہتے تھے اور یہ عبداللہ ابن احمد کے شاگردوں کی جماعت میں داخل ہو گئے۔ ابوبکر شافعی کی وفات کے بعد یہ بذات خود عبداللہ بن احمد سے تلمذ کے مدعی ہو گئے، اس لئے لوگوں نے ابوبکر شافعی کے ساتھ انکو بھی عبداللہ بن احمد کے تلامذہ میں شمار کر لیا۔ اُس وقت مسند احمد کا کوئی وجود تو تھا نہیں کہ واقعی مسند احمد کو کوئی عبداللہ سے سنتا، یا اُن کو سناتا اور لوگ یہ خیال کرتے کہ ان کی عمر عبداللہ کے وقت میں اتنی تھی یا نہیں کہ ساٹھ ہزار روایات کا مجموعہ یہ عبداللہ سے اخذ کر سکیں۔ ان کے ادعائے تلمذ سے ابتدا میں لوگ اس قدر سمجھے کہ کچھ حدیثیں یہ آخر وقت میں عبداللہ بن احمد سے سنی ہوں گی، اس وجہ سے یہ تلمذ کا دعویٰ کر رہے ہیں۔ کسی کو کیا پڑی تھی کہ مخواہ اتنی سی بات کو جھٹلاتا، جس کے امکان کا قرینہ بھی موجود تھا۔ ہاں اگر یہ عبداللہ بن احمد کے مشہور تلامذہ کے مسند احمد کا نام لیتے، جب البتہ اکابر محدثین ان کی خبر لینے کو تیار ہو جاتے اور پوچھتے کہ مسند احمد کس جانور کا نام ہے، تم کہاں سے لائے؟ ہم لوگوں کو تو یہ نعمت عظمیٰ عبداللہ سے ملی، جو برسوں عبداللہ کی خدمت میں رہے۔

قطیعی نے عبداللہ بن احمد کا وقت نہیں پایا

Marfat.com

اور ساری زندگی حدیث کی خدمت میں گزاری اور گزار رہے ہیں اور تم کو ہم سب لوگوں سے چھپا کر بلا کسی استحقاق کے عبداللہ بن احمد نے اتنی بڑی دولت چپ چاپ سونپ دی! آخر تم میں کون سے سُرخاب کے پر لگے تھے۔

یہ مسند احمد کب اور کس طرح وجود میں آئی، اس کی تفصیل آگے آتی ہے۔ خاص مسند احمد کے ذکر میں ابھی سلسلے کی آخری کڑی یعنی امام احمد بن حنبل کا مختصر سا ترجمہ سُن لیجئے۔

امام احمد بن محمد بن حنبل

ان کی ولادت ۱۶۴ھ میں اور وفات ۲۴۱ھ میں ہوئی۔ ۷۷ سال کی عمر پائی۔ امام شافعی، ابن مہدی، ابوالولید، عبدالرزاق، وکیع، یحییٰ بن آدم اور یزید بن ہارون سے یہ خود بھی روایت کرتے ہیں۔ اور یہ لوگ بھی ان سے روایت کرتے ہیں یعنی یہ سات آدمی ان کے شاگرد بھی ہیں اور استاد بھی۔ اور قتیبہ، داؤد بن عمرو اور خلف بن ہشام ان سے عمر میں بڑے تھے، مگر ان کے تلامذہ میں تھے اور احمد بن الحواری اور یحییٰ بن معین، علی بن المدینی، حسین بن منصور، زیاد بن ایوب، ابو قدامۃ السرخسی، محمد بن رافع، محمد بن یحییٰ بن ابی سمینہ اور عبدالرحمٰن بن ابراہیم جن کا لقب "رحیم" تھا، یہ نو آدمی ان کے دونوں صاحبزادے بھی ان کے خاص شاگرد تھے۔ ان اکابر محدثین کے علاوہ ابوبکر الاثرم، بقی بن مخلد، حرب الکرمانی، صنبلی بن اسحاق، شاہین بن السمیدع اور میمون بھی انکے مشہور تلامذہ میں سے تھے۔ پھر امام بخاری، امام مسلم اور ابوداؤد بذات خود بلا واسطہ ان سے روایت کرتے ہیں اور بواسطہ عبدالرحمٰن اسود بن عامر الشافعی ملقب بہ شاذان سے بھی۔ امام احمد کے آخری شاگرد، جو امام احمد کے بعد عبداللہ بن احمد کے بھی شاگرد ہوئے۔ مشہور محدث ابوالقاسم البغوی ہیں اور ان بزرگواروں کے علاوہ ایک جماعت امام احمد کے تلامذہ میں ہے جن میں سے بہتیروں کے نام تہذیب التہذیب وغیرہ کتب رجال میں مذکور ہیں۔

سلسلہ اسناد کے تمام افراد کو جان لینے کے بعد اب خاص مسند احمد کے وجود اور اسکی نوعیتوں پر غور فرمائیے۔

مسند احمد

اب یہ چیز ہر صاحب عقل بغیر ذہن پر زور ڈالے سمجھ سکتا ہے اگر امام احمد بن حنبل اپنی زندگی کوئی مجموعہ اپنی حدیثوں کا قلم بند کر جاتے یا اپنے صاحبزادے عبداللہ سے لکھواتے تو جس طرح امام مالکؒ سے ان کی موطا ان کے سینکڑوں شاگردوں نے سُنی۔ اور ہر سننے والا ان سے موطا کی روایت کرتا تھا اسی طرح امام احمد کے مسند کو بھی عبداللہ کے علاوہ ان کے دوسرے تلامذہ بھی ضرور امام احمد سے سنتے اور اسکی روایت کرتے۔ اتنے بڑے بڑے محدثین، جو نہ صرف امام احمد کے شاگرد تھے، بلکہ استاد بھی تھے، یا خاص اقران میں یا عمر میں بڑے تھے یا اپنے علم و فضل کی وجہ سے علم حدیث میں بہت بلند پایہ رکھتے تھے، باوجود اس کے کہ یہ سب کے سب امام احمد کے شاگرد تھے، آخر یہ سارے کے سارے اس ملسند ضخیم کے وجود سے بالکل بے خبر کیوں رہے اور امام ان سب کے سب سے اپنی اس کتاب کو پوشیدہ کیوں رکھا؟ یہاں تک کہ اپنے دوسرے بیٹے صالح کو بھی نعمت عظمیٰ سے بالکل محروم ہی رکھا! تعجب ہے کہ امام بخاری اپنی تاریخ میں امام احمد کا ذکر خیر کرتے

Marfat.com

کا کوئی ذکر فرماتے ہیں نہ کتاب الزہد کا۔ آخر امام احمد کو کیا ہوگیا تھا کہ اشاعتِ حدیث و اشاعت دین کے عوض اپنے تمام شاگردوں سے بالکل کتمانِ حدیث و کتمانِ علم فرمایا اور صرف اپنے ہی ایک صاحبزادے عبداللہ کو اس کتاب مکنون کا محرم راز بنایا؟ آخر دوسرے لوگوں سے اس اخفاء و کتمان کی کیا ضرورت پڑی؟ کیا ان کے تلامذہ میں سے عبداللہ کے سوا کوئی بھی اس امانتِ عظمیٰ کا امین نہیں ہوسکتا تھا؟

عبداللہ کے تلامذہ ابوالقاسم البغوی اسی طرح عبداللہ بن احمد کے تلامذہ میں سے ابوالقاسم البغوی جنکی ولادت ۲۱۲ھ کی ہے یعنی عبداللہ سے ایک سال بڑے ہی تھے اور خاص امام احمد کے آخری شاگرد تھے یعنی عبداللہ کے خواجہ تاش استاد بھائی بھی تھے اور شاگرد بھی اور خود مشہور بلند پایہ محدث تھے ۳۱۷ھ میں عبداللہ بن احمد کے ستائیس سال بعد وفات پائی۔

سلیمان بن حرب الطبرانی سلیمان بن احمد بن ایوب اللخمی الطبرانی جن کی ولادت ۲۶۰ھ کی اور وفات ۳۶۰ھ میں ہے پورے سو برس کی عمر پائی، عبداللہ کی وفات کے وقت تیس برس کے تھے اور تقریبی سے تیرہ سال بڑے تھے اور اقول ابن حجر ۱۲ سال کی عمر سے حدیثیں سننے لگے اور برابر عبداللہ بن احمد کے ساتھ لگے رہے۔

احمد بن کامل بن شجرہ احمد بن کامل بن شجرہ القاضی البغدادی، انکی ولادت بھی ۲۶۰ھ ہی کی ہے۔ نوے سال کی عمر پاکر ۳۵۰ھ میں راہیٔ جنت ہوئے۔ ابن حجر نے انکو کان من اوعیۃ العلم (علم کا ظرف) لکھا ہے۔

محمد بن مخلد محمد بن مخلد بن حفص، جنھوں نے کافی عمر پاکر ۳۳۱ھ میں وفات پائی، دارقطنی جیسے مشہور محدث کے شیوخ میں تھے اور تقریبی سے کافی بڑے تھے۔ عمر میں بھی اور علم و فضل میں بھی۔ ابن حجر ان کے متعلق لکھتے ہیں کہ اپنے وقت میں سب سے بڑے عالم تھے۔ وغیرہم۔

غرض ایسے تلامذہ کے ہوتے عبداللہ بن احمد کو کیا ہوگیا تھا کہ وہ ایسی کتاب مکنون مسند احمد، جس کو امام احمد نے اپنے تمام شاگردوں سے چھپاکر صرف انھیں کو بطور ایک پوشیدہ راز کے عطا فرمایا تھا۔ ایسی نعمت عظمیٰ کو انھوں نے بھی اپنے شاگردوں سے چھپاکر بلا استحقاق دیا بھی تو صرف ایک سترہ سال کے چھوکرے ابوبکر قطیعی کو۔

تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو!

جس طرح امام احمد نے اپنے دوسرے تمام تلامذہ سے حتیٰ کہ اپنے دوسرے بیٹے سے بھی اس مسند کو پوشیدہ رکھا۔ بالکل اسی طرح عبداللہ نے بھی اپنے تمام شاگردوں سے اس باپ کی دی ہوئی نعمت کو پوشیدہ ہی رکھا اور ایک گھر سے باہر کے کم عمر چھوکرے کے حوالے کر دیا۔

امام احمد کو تو شاید اولاد کی محبت نے اس رازداری پر مجبور کر دیا ہو اور دوسرے بیٹے سے شاید وہ کچھ خفا رہتے ہوں، اس لئے اپنی ساری عمر کی کمائی صرف ایک ہی بیٹے کو دے گئے اور دوسرے کو بالکل محروم کر دیا۔ مگر یہ

Marfat.com

ابوبکر قطیعی جیسے سترہ سال کے چھوکرے سے عبداللہ کو کون سا رشتۂ محبت تھا کہ عبداللہ نے اپنے تمام برابر والے اور علم و فضل میں مستند شاگردوں پر اس چھوکرے کو ترجیح دی؟ اور سب کو اس نعمت سے محروم ہی نہیں، بلکہ بالکل بے خبر رکھا۔ کسی سے کہا تک نہیں کہ میرے پاس والد ماجد کی ایک کتاب ہے۔

پھر ابوبکر قطیعی کے تلامذہ میں بھی ابن المذہب کے علاوہ کچھ لوگ مثلاً حافظ ابونعیم احمد بن عبداللہ بن اسحٰق صاحب الحلیۃ اور علی بن الحسن[1] الصقلی القزوینی وغیرہما بھی تھے۔ مگر ابن المذہب کے سوا کوئی دوسرا شخص اس مسند کی روایت نہیں کرتا، آخر اسکی کیا وجہ ہے؟

ابن المذہب کے بھی دو چار شاگرد ضرور ہوں گے، مگر ابن المذہب سے بھی صرف ابوالقاسم ہبۃ اللہ ہی تنہا اس کی روایت کرتے ہیں اور کوئی دوسرا نہیں۔

اور ابوالقاسم ہبۃ اللہ صاحب کے بعد صرف حنبل بن اسحٰق الرصافی ہی اس کو تمام لئے پھرتے ہیں، یعنی چھٹی پشت سے اس مسند کی روایتی نسل کی چھوٹی چھوٹی شاخیں پھوٹنا شروع ہوتی ہیں اور رفتہ رفتہ ادھر اُدھر پھیلنے لگتی ہیں مگر پانچ پشت اوپر تک برابر مکمل رازداری اور پورے اخفا و کتمان کے ساتھ ایک ایک ہی شخص ہر دور میں اس مسند کا تنہا راوی چلا آتا ہے۔ اگر کوئی حدیث اس طرح کی ہو، جس کا راوی مسلسل ہر عہد میں ایک ایک ہی شخص رہا ہو، اور وہ بات ایسی ہو، جس کے جاننے والوں کے لئے عقل تعدد چاہتی ہو، تو ایسی حدیث احاد قرار دیکر ضعیف اور ناقابل احتجاج قرار دے دی جاتی ہے اور یہاں ساٹھ ہزار حدیثوں کا پورا مجموعہ پانچ پانچ دو تک ایک ایک ہی شخص وساطت سے چلا آرہا ہے، مگر کسی محدث کے منہ میں زبان نہیں کہ اس پورے مجموعہ کو احاد کہہ کر ٹھکرا دے، خصوص جب اس کے دو آخری راوی بالکل مجہول الحال ہیں اور اس کے اوپر کے دو راوی ابن المذہب اور ابوبکر قطیعی غیر اور ناقابل احتجاج۔

سلسلہ مسند کی اصلی اور ابتدائی مگر پوشیدہ کڑی

ابوبکر شافعی۔ عبداللہ بن احمد کے تلامذہ میں ابن حجر اور تمام ائمہ رجال ابوبکر شافعی کا نام لکھتے ہیں اور ضرور عبداللہ بن احمد کے ساتھ کچھ مدت تک لگے لپٹے رہے، ابن حجر ان کا مطلق ذکر ہی نہیں کرتے، البتہ امام ذہبی تذکرۃ الحفاظ جلد ۳ صفحہ ۹۱ میں ان کا ترجمہ سپرد قلم فرمایا ہے۔ مگر افسوس کہ وہ ان کی حقیقت حال تک نہ اور نہ ان کو کوئی خاص ضرورت محسوس ہوئی کہ ان کے متعلق اتنی کرید کرتے۔ ابن حجر غالباً ان کی حقیقت ہو گئے تھے، اس لئے ان سے قطع نظر ہی کرنا مناسب سمجھے۔ نہ تہذیب التہذیب میں ان کا ذکر کیا نہ لسان تقریب میں، نہ تعجیل المنفعۃ میں۔ تعجب یہ ہے کہ دولابی نے بھی الاسماء والکنی میں ان کا ذکر نہ کیا۔

[1] علی بن الحسن الصقلی القزوینی کا ترجمہ لسان المیزان جلد ۴ صفحہ ۲۲۰ میں ہے۔ سنہ ۴۰۳ھ میں وفات پائی۔

Marfat.com

الانساب میں یاد کیا ہے۔ لکھا ہے کہ یہ مقام حتّی میں پیدا ہوئے اور بغداد میں سکونت اختیار کی۔ اس لئے حتّی بھی اپنے آپ کو لکھتے ہیں اور بغدادی بھی، یعنی کبھی یہ کبھی وہ لکھا ہے کہ عمر زیادہ پائی، یہاں تک کہ دارقطنی نے بھی ان سے روایت کی ہے۔ لکھا ہے کہ ابوعلی بن شاذان وغیرہ نے ایک بار مسجدوں میں سبّ صحابہؓ لکھا ہوا پایا تو انھوں نے اپنی برأت کے لئے لوگوں کو فضائل صحابہؓ لکھوانا شروع کیا۔ سنہ ۲۶۰ھ میں پیدا ہوئے، سنہ ۳۵۴ھ میں مرے۔ دارقطنی وغیرہ نے انکی توثیق کی ہے۔

محمد بن عبداللہ بن ابراہیم ثابت۔ ابن حجر نے لسان المیزان جلد ۵ صفحہ ۲۲۰ میں محمد بن عبداللہ بن ابراہیم بن ثابت ابوبکر البغدادی کا ترجمہ لکھا ہے اور لکھا ہے کہ ان کو زعم تھا کہ یحییٰ بن معین اور امام احمد بن حنبل سے یہ روایت کرتے ہیں، مگر دارقطنی نے ان کو دجّال کہا ہے اور خطیب نے لکھا ہے کہ یہ حدیثیں گھڑا کرتے تھے۔ مجھے تو اس کا شبہ سا ہوتا ہے کہ یہ حضرت ابوبکر شافعی ہی ہیں۔ دارقطنی کی توثیق و روایت کا ذکر جو سمعانی نے کیا ہے وہ کسی معتبر ذرائع سے سمعانی تک نہیں پہنچی ہوگی۔ واللہ اعلم۔ اس لئے کافی تفحص و جستجو کرکے میں جس صحیح نتیجے پر ان کے متعلق پہنچا ہوں وہ حسب ذیل ہے۔

موسیٰ بن سہل الوشّاء یہ سنہ ۲۰۰ھ میں پیدا ہوئے اور سنہ ۲۵۴ھ میں دنیا سے رخصت ہوئے۔ انکے سب سے پہلے استاد موسیٰ بن سہل الوشّاء تھے، جن کو عقیلی نے غیر مشہور، دارقطنی نے ضعیف اور برقانی نے قطعی ضعیف لکھا ہے۔ ابن علیہ کے سب سے آخری شاگرد تھے۔ سنہ ۲۷۸ھ میں وفات پائی۔

محمد بن شداد المستملی۔ جب ابوبکر شافعی موسیٰ بن سہل کی آغوش تربیت سے بقضائے الٰہی محروم ہوگئے تو محمد بن شداد المستملی کی گود میں آگئے اور اُن سے تعلیم پانے لگے۔ ان کو بھی برقانی نے ضعیف، امام ذہبی نے معتزلی اور منکر الحدیث اور دارقطنی نے ضعیف و ناقابل احتجاج قرار دیا ہے۔

درحقیقت ابوبکر شافعی کی پوری دماغی پرورش انھیں دونوں وشّاء و مستملی کی آغوش تربیت میں [illegible] میں ابوبکر شافعی پیدا ہوئے اور سنہ ۲۷۲ھ سے وشّاء کی خدمت میں رہنے لگے، یعنی ۱۲ سال کی عمر سے۔ گزشتہ دو اساتذہ کے

محمد بن سعید البورقی علاوہ محمد بن سعید البورقی کے بھی یہ شاگرد رشید ہیں۔ یہ بورقی صاحب وہی ہیں جو سلیمان بن جابر سے روایت کرتے ہیں اور مشہور و معروف وضّاع ہیں، یعنی جھوٹی حدیثیں گھڑنے والے۔ اور پھر محمد بن یونس

محمد بن یونس الکدیمی الکدیمی، جو جانے بوجھے کذاب اور افترا پرداز ہیں۔ ان کے بھی یہ نہایت خاص شاگرد

ابوبکر شافعی کے بعض دوسرے شیوخ ہیں اور اسی قسم کے چند اور مثلاً محمد بن احمد بن نصر ابوجعفر الترمذی۔ اسحٰق بن ابراہیم بن سنین الخفی جن کی کتاب الدیباج مشہور ہے۔ محمد بن ہارون [illegible] الہاشمی، سعید بن ہاشم البطری، ابوعمارۃ محمد بن احمد بن مہدی، محمد بن الحسن بن محمد بن سماعہ الحضرمی، ابراہیم بن محمد بن [illegible] السمعی البصری، اور انھیں جیسے بعض دوسرے مجروحین و متروکین و ضعفاء کے حلقۂ فیض سے یہ استفادہ [illegible] رہے

Marfat.com

مگر درحقیقت یہ بورتی اور کدیمی کی تیار کردہ ایک پوشیدہ پارٹی تھی، جو ایک پوشیدہ گہری سازش کے ماتحت باہم تقسیم اسمائے صحابہؓ واکابر تابعینؒ کرکے ان کے ناموں سے موضوعات کا انبار لگا رہی تھی اور اس کے لئے ابوبکر شافعی تیار کئے گئے کہ یہ عبداللہ بن احمد کے پاس آیا جایا کریں اور ان کے تلامذہ کی فہرست میں اپنا نام لکھوالیں تاکہ عام محدثین ان کو عبداللہ کا شاگرد جان جائیں۔

یہ باوجود عبداللہ بن احمد کی شاگردی کا شرف حاصل کرنے کے حنبلی نہ بنے بلکہ شافعی بنے رہے اور اپنے کو حنبلی نہیں بلکہ شافعی مشہور کیا، تاکہ دونوں فرقوں سے تعلقات رہیں، مگر یہ ابوبکر شافعی صاحب دراصل شیعہ امامیہ تھے اور تقیۃً اپنے

ابوبکر شافعی دراصل شیعہ تھے کو شافعی مشہور کیے رہے، اور تقیہ ہی کرکے عبداللہ بن احمد کے شاگرد بھی بنے تھے۔ اب اس دعوے کی دلیل اور اجمال کی تفصیل یوں سنئے:

تذکرۃ الحفاظ میں ابوبکر شافعی ان ابوبکر شافعی صاحب کا پورا نام امام ذہبی تذکرۃ الحفاظ میں یوں تحریر فرماتے ہیں۔ دیکھئے جلد ۳ صفحہ ۹۱۔ محمد بن عبداللہ بن ابراہیمؒ بن عبدویہ البغدادی۔ انھوں نے اہلِ سنّت کو دھوکا دینے کے لئے جس طرح مسلک شافعی بہ ظاہر اختیار کرکے اپنے ساتھ شافعی کی نسبت کو شہرت دے رکھی تھی، اسی طرح اپنی اصل کنیت جو ابوالحسن تھی، اہلِ سنت کو دھوکا دینے کے لئے ابوبکر سے بدل کر مشہور کر رکھی تھی اور اس طرح ابوبکر شافعی ہی لقب سے مشہور و متعارف رہے۔ یہ بھی خوب یاد رکھئے کہ ان کے پردادا کا اصلی نام یوسف تھا، مگر انھوں نے عبدویہ لقب دیکر اہل سنت میں مشہور کیا، اسی لیے شیعوں کی بعض کتب رجال میں ان کا نام یوں ہے "محمد بن ابراہیم بن یوسف الکاتب"[1]

خلاصۃ الاقوال میں ابوبکر شافعی یکنّیٰ ابا الحسن" جیسا کہ "خلاصۃ الاقوال" میں علامہ حلّی مشہور محدث شیعہ نے لکھا ہے اور اس طرح ان کا نام تحریر فرماکر لکھتے ہیں کہ "قال احمد بن عبدون ھو ابوبکر الشافعی مولدہ سنۃ ۲۸۱ھ وکان علی الظاھر یتفقہ علی مذھب الشافعی ویریٰ رای الشیعۃ الامامیۃ فی الباطن وکان فیھا علی المذھبین وله علی المذھبین کتب۔ یعنی احمد بن عبدون نے فرمایا کہ وہ ابوبکر شافعی ہیں، انکی ولادت حسینی[2] سال کے حساب سے ۲۸۱ھ میں ہوئی اور یہ بظاہر مذہب شافعی کی فقہ پر تھے، مگر باطن میں شیعۂ امامیہ کا عقیدہ رکھتے تھے اور دونوں مذہب کے فقہ تھے اور دونوں مذہب پر ان کی کتابیں ہیں۔" دیکھئے خلاصۃ الاقوال صفحہ اور دوسرے شیعہ محدّث امام فن رجال

منتہی المقال میں ابوبکر شافعی ابوعلی محمد بن اسمٰعیل بن عبدالجبار اپنی کتاب منتہی المقال میں لکھتے ہیں "ابوبکر الشافعی ھو محمد بن یوسف کذا فی المجمع فلعلّہٗ یُنسب تارۃً الیٰ ابیہ وتارۃً الیٰ جدّہٖ وذکرہ ثقاتھم۔" یعنی ابوبکر شافعی، وہ محمد بن یوسف ہیں۔ ایسا ہی کتاب "المجمع" میں ہے۔ شاید انکی نسبت کبھی

---

[1] یعنی محمد بن ابراہیم بن یوسف الکاتب جن کی کیفیت ابوالحسن ہے، جیسا کہ ابتدائی ترجمہ میں علامہ حلّی نے لکھا ہے۔

[2] حسینی سال کی تفصیل میری کتاب تطہیر آیۃ التطہیر میں ہے۔ مختصراً اگلے صفحہ کے حاشیہ پر لکھا ہے۔

کی طرف کی جاتی ہو اور کبھی ان کے دادا کی طرف" یعنی کسی نے محمد بن ابراہیم کہا، کسی نے محمد بن یوسف کہہ دیا۔ اور لوگوں نے ان کو ثقہ لوگوں کے طبقے میں ذکر کیا ہے۔"

علامہ مجلسی کی الوجیزہ علامہ مجلسی میرے مشہور شیعہ مجتہد و محدث اپنی کتاب الوجیزہ میں لکھتے ہیں، محمد بن ابراہیم بن یوسف ح" شیعوں کی کتاب رجال میں کسی نام کے بعد ح کی علامت جو بنی ہوتی ہے، وہ ممدوح کا مخفف ہے خود مصنفین کتب

ابوبکر شافعی کے عوض ابوبکر القتانی رجال شیعہ نے اس کی تصریح کر دی ہے، دیکھئے وجیزہ ص۱۶۲ مگر اسی رسالہ کے باب الکنیٰ میں ابوبکر شافعی کے عوض "ابوبکر القتانی" لکھ کر وہی علامت ح کی بنا دی ہے، جو ان کے نام کے ساتھ بنائی ہے اور ابوبکر شافعی کا ذکر باب الکنیٰ میں نہیں کیا۔

شرح تصریحات علمائے شیعہ علامہ حلی اور صاحب منتہی المقال نے ابوبکر شافعی کی نشان دہی کی، مگر علامہ مجلسی نے نام کی تصریح تو کی، مگر کنیت کا مطلق ذکر ہی نہ کیا، صاف کھا بدے، اور ابوبکر شافعی کے عوض ابوبکر القتانی لکھ کر اسطرح اس پر پردہ ڈالا کہ کسی کا ذہن ہی نہ جائے کہ یہ ابوبکر شافعی ہی ہیں اور ان تینوں نے مل کر ابوبکر شافعی کے باپ کا نام یعنی عبداللہ کو درمیان سے بالکل غائب کر دیا۔ یا ممکن ہے کہ ابوبکر شافعی نے خود ہی تقیہ کے ماتحت اہلِ سنت کو اپنا سلسلۂ نسب بتانے میں ایک نام عبداللہ کا بڑھا دیا ہو۔ واللہ اعلم۔ پھر کوئی تو محمد بن ابراہیم بن یوسف لکھتا ہے اور کوئی صرف محمد بن یوسف۔ وہ تو غنیمت ہوا کہ خود صاحب منتہی المقال نے یہ گتھی اسطرح سلجھا دی کہ کوئی ان کو ان کے باپ کی طرف منسوب کرتا ہے اور کوئی ان کے دادا کی طرف۔ مگر ان کے دادا یا پردادا کا لقب جو عبدویہ انھوں نے خود دے رکھا تھا، اس کو ان میں سے کوئی بھی نہیں لکھتا۔ تماشا یہ ہے کہ سال وفات کا بھی مطلق ذکر نہیں کیا جاتا۔ صرف علامہ حلی سال ولادت تو لکھتے ہیں، مگر متعارف طریقہ جو سال ہجری کا ہے، اس سے گریز کر کے ایک بالکل غیر متعارف چیز یعنی سال حسینی[1] کے حساب سے جس سے علمائے اہلِ سنت تو کجا، شیعوں میں سے بھی خاص خاص ہی لوگ واقف ہیں اس طرح کی تدلیس یعنی ناموں میں ادل بدل شیعی علماء بہت کیا کرتے ہیں کہ علمائے اہل سنت اگر یہ کہیں کہ یہ تو شیعہ ہے، تو جواب میں کہہ دیا جائے کہ نہیں تو، شیعہ تو دوسرا ہے، جس کے بارے میں آپ کہتے ہیں وہ سنی ہے، چنانچہ دونوں کے نام میں کافی فرق موجود ہے۔ آپ کا ابوبکر شافعی محمد بن عبداللہ بن ابراہیم بن عبدویہ ہے، جس کی ولادت ۲۶۰ھ کی ہے اور ہمارا ابوبکر شافعی

---

[1] سال حسینی کا حال مجھ کو اخی الاعظم حضرت مولانا قاری شاہ محمد سلیمان پھلواری سے اور انکو نواب حسن الملک سے معلوم ہوا، رحمہما اللہ تعالیٰ۔ جس کی تفصیل اپنے رسالے تطہیر آیۃ التطہیر من دنس هفوات الرواة فی التفسیر میں لکھ دی ہے۔ یہاں طوالت کے خوف سے اسکا اعادہ غیر ضروری سمجھتا ہوں۔ مختصر یہ ہے کہ اسکا آغاز بعثت نبویہ سے آٹھ سال پیشتر سے اہل تشیع کرتے ہیں اور جسکی بنیاد ایک خواب بتاتے ہیں جو شیعوں کی روایت کے مطابق رسول اللہ صلعم کو امام حسین رضؓ کے متعلق بعثت سے آٹھ سال پہلے دکھایا گیا تھا اور ان کے یہاں اس خواب کا اخفا، وکتمان بھی فرض ہے اور سال حسینی کا اخفا بھی بکثرت مخالف کاروں پر وہ ایک مرتبہ اس کا استعمال بھی واجب ہے۔ غالباً اسی بنا پر علامہ حلی نے استعمال کیا ہے۔

Marfat.com

محمد بن ابراہیم بن یوسف یا محمد بن یوسف ہے، جس کا سال پیدائش ۲۸۱ھ ہے باقی رہا سال حسینی، تو اگر امام حسینؓ کی ولادت سے بھی لیجئے، تو سال ہجری سے بھی کم ہی ہوگا نہ کہ اکیس برس آگے، اس لئے یہ دوسرے ہی ابوبکر شافعی ہیں جو پہلے شافعی مذہب رکھتے تھے۔ اس کے بعد شیعہ امامیہ مذہب اختیار کر لیا، مگر پہلے لقب سے مشہور رہ گئے۔ اس طرح کی تدلیس شیعہ

علمائے شیعہ کی تدلیسیں ہمیشہ کرتے رہتے ہیں۔ مثلاً ملاحظہ ہو:

مندل بن علی العنزی مندل بن علی العنزی اہل سنت کی کتابوں میں ایک شیعہ راوی ہے، مگر شیعوں نے ان کو اپنی کتابوں میں مبدّل بہ علی العتری لکھا ہے اور تصریح کر دی کہ مبدل بائے موحدہ تحتانیہ سے اور العتری تائے مثناۃ فوقانیہ و رائے مہملہ سے۔ تاکہ دونوں دو شخص سمجھے جائیں اور مندل کے حقیقی بھائی حبان بن علی العنزی کو صرف حیان بنا کر تصریح کر دی

حبان بن علی العنزی کہ یائے مثناۃ تحتانیہ سے اور بس۔ یہاں عنزی کو عتری نہیں بنایا، تاکہ یہ دونوں ایکدوسرے کے بھائی بھی نہ سمجھے جائیں۔ دونوں کے نام بھی کتابوں میں اتنے فاصلے سے تیار ہوتے ہیں کہ دونوں میں کسی مناسبت کا خیال بھی نہ جا سکے گا۔ مندل کا نام باب المیم میں بہت بعد کو آئے گا اور حبان کا نام باب الحار مہملہ میں کتاب کے دوسرے ہی رُبع میں موجود ہوگا۔

اسی طرح ابوجعفر محمد بن جریر بن یزید الطبری جن کی تفسیر اور تاریخ مشہور ہے اور جو بالاتفاق شیعہ تھے۔ ابوجعفر محمد بن جریر بن رستم الطبری لکھ دیا۔ تاکہ اہل سنت دونوں کو دو شخص سمجھ لیں، چنانچہ سمجھے اور امام ذہبی و ابن حجر جیسے علمائے رجال دونوں کو دو سمجھتے رہے، حالانکہ رستم طبرستان کا رہنے والا تھا، اسلام قبول کرنے کے بعد اس کا نام یزید رکھا گیا۔ ابن جریر نے خود یہ تدلیس کی، کہ جو کتابیں خاص شیعوں کے لئے لکھیں، اس میں اپنے دادا کا نام اس نے رستم ہی رہنے دیا اور جو کتابیں عام مسلمانوں کے لئے تصنیف کیں، ان میں اپنے دادا کا نام یزید لکھا۔ شیعوں کے لئے جو کتابیں لکھیں، وہ عام نگاہوں سے اُسوقت تک برابر پوشیدہ رہیں، جب تک کہ ایران میں حکومت صفویہ قائم نہ ہوئی تھی۔ جس طرح شیعوں کی تمام خاص کتابیں اور مخصوص عقیدے اس سے پہلے تک برابر پردۂ کتمان میں رہے۔ ابن جریر کی خالص شیعی تصنیفیں بھی نہاں خانہ کتمان میں محفوظ رہیں۔ حکومت صفویہ کے استحکام کے ساتھ ہی ساری پوشیدہ چیزیں منصۂ شہود پر آگئیں۔ اور شیعے اپنے اصلی عقیدے اور حقیقی رنگ روپ میں نمایاں ہوگئے۔ اس وقت اس کا خیال ہوا کہ ایسا نہ ہو کہ ابن جریر کی تصنیفات سے علمائے اہل سنت بدظن ہو کر اس کو حجت و سند نہ سمجھیں، تو پھر جو جو تخم ریزیاں ابن جریر اپنی اس تفسیر اور تاریخ میں کر گئے ہیں نہ ہو سکیں گی، اس لئے فوراً علمائے شیعہ نے اپنی کتابوں میں ایسی تصریحیں لکھنا شروع کر دیں، جس سے یہ معلوم ہو کہ ابن جریر ایک نہیں بلکہ دو تھے اور وہ علمائے و عقلائے شیعہ جو ایران سے باہر اہل سنت کے ساتھ گھلے ملے ہیں زبانی اس کا پروپاگنڈا بھی کرتے رہے اور ایک خیال اہل سنت کو بھی ایسا رہا کہ اگر اس چیز کو ہم فلاں فلاں حقیقی وجوہات کی وجہ ہی سے سہی مگر رد کر دیتے ہیں۔ و مشتبہ و غیر مستند مان لیتے ہیں تو پھر یہ چیز

ہاتھ سے چلی جاتی ہے اور ایسی دوسری چیز ہمارے پاس ہے نہیں جو اس کا نعم البدل ہو۔ اس لئے ہم ان صحیح واقعات و واقعی وجوہات سے چشم پوشی کرلیں گے، یہاں تک کہ بربنائے ضرورت اسکی واقعیت ہی سے انکار کردیں گے، مگر اس دولت کو ہاتھ سے جانے نہ دیں گے۔ یہ حلوائے بادام کی قاب فی الجملہ زہر آلود ہی سہی، مگر ہے تو حلوائے بادام اسکی زہر آلودگی سے انکار کرکے تھوڑا تھوڑا کھاتے رہیں، تو اس کا مزا تو آئے گا، ہوس تو مٹے گی۔ زہر آلود کہہ کر واپس کردینے کی ہوس اور ستائے گی اور یہ یاد کرکرکے کہ ہائے کیا خوش رنگ اور خوش بُو حلوا تھا اور بھی رہ رہ کے طبیعت بیچین ہوگی۔ بس یہی وجہ تھی کہ تفسیر طبری و تاریخ طبری کو بھی اہل سنّت نے گلے لگایا اور مسند امام احمد کو بھی۔ اور اسی طرح سنن نسائی اور مستدرک حاکم وغیرہ کو بھی۔

رجوع بسوئے مقصد۔ غرض اتنی تفصیل کے بعد آپ کو ابوبکر شافعی کی پوری حقیقت معلوم ہوگئی، کہ یہ ایک پکا منافق شخص تھا، درحقیقت شیعہ رافضی تھا اور تقیہ کرکے شافعی بنا ہوا عبداللہ بن احمد کے ساتھ لگا رہا۔ اور اس کی پیٹھ پر وہ کدیمی اور بورقی والی پارٹی تھی، جو درحقیقت بالکل اسی طرح تقیہ باز تھی۔ اور وہ سب کے سب

تصریح سلسلہ تالیف مسند شیعے ہی تھے مگر اہلِ سنت بنے ہوئے۔ عبداللہ بن احمد کی وفات کے بعد اپنی پارٹی کی جمع کردہ جھوٹی سچی روایات کو یک جا کرکے پورا ذخیرہ" حدثنا عبد الله حدثنی ابی لکھ لکھ کر مرتب کرڈالا (یہ شخص تھا بڑا لکھاڑ اور خوشخط، چنانچہ شیخ حلّی نے انکے نام کے ساتھ الکاتب کا لفظ لکھا بھی ہے) اور اس کی متعدد نقلیں بھی اپنی جماعت کی مدد سے اس نے مہیا کرلیں۔ مگر فوراً اسکی اشاعت ہوتی تو پھر عبداللہ کے دوسرے تلامذہ نہایت سختی کے ساتھ تکذیب کرتے، اس کا ڈر لگا ہوا تھا، اس لئے جب تک عبداللہ کے تمام بڑے بڑے تلامذہ ایک ایک کرکے راہیٔ جنّت نہ ہولئے، اُس وقت تک تو کسی سے مسند احمد کا نام تک نہیں لیا گیا یہانتک کہ اس انتظار میں ابوبکر شافعی خود ہی ۳۵۴ھ میں دنیا سے رخصت ہونے لگے اور ابھی طبرانی جیسا جلیل القدر محدث شافعی ۳۶۰ھ عبداللہ بن احمد کے شاگرد رشید موجود تھے۔ آخر ابوبکر شافعی نے مرتے وقت ابوبکر قطیعی کو یہ امانت سپرد کردی اور بزبانِ حال کہا کہ ؎ سپردم بتو مایۂ خویش را

قطیعی تو ابوبکر شافعی کے ساتھ رہتے ہی تھے۔ اور انھیں کے تربیت یافتہ و ہم مسلک و ہم خیال، پھر سن شعور کے بعد سے برابر شریک کار بھی رہے، یعنی برابر ترتیب مسند میں بھی ابوبکر شافعی کے معین و مددگار رہے، اس لئے انھوں نے اس مہم کو اپنے ذمے بشوق تمام لے لیا۔ اور اب کام ہی کیا تھا۔ پکی پکائی کھیر تو سامنے تھی۔ صرف کھا لینا طبرانی کے انتقال کے بعد یہ اِدھر اُدھر گھومنے لگے۔ مگر پھر بھی کہیں مسند احمد کا نام لینے کی ہمت نہیں پڑتی تھی کہ عبداللہ کا شاگرد مشہور ہی کرچکے تھے اور لوگوں نے تسلیم کرلیا تھا کہ عبداللہ کے آخر وقت میں کچھ حدیثیں اُن سے سُنی ہوں گی ۱۶-۱۷ سال کی عمر محض بچپن کی عمر نہیں۔

Marfat.com

پھر جس طرح ابوبکر شافعی کو یہ ابوبکر قطیعی مل گئے تھے، بالکل اسی طرح ابوبکر قطیعی کو بھی "جوینده یابنده" کے مطابق آخر ایک ہم راز شاگرد ابن المذہب مل ہی گیا، جو درحقیقت منافقت میں ابوبکر شافعی اور ابوبکر قطیعی دونوں کا ہم مذہب تھا۔ اسی ابن المذہب نے مسند احمد کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا اور ابوبکر قطیعی کے انتقال کے کم سے کم پچاس برس بعد یعنی پانچویں صدی ہجری کے پہلے ربع کے گزر جانے کے بعد دیکھا کہ اب میدان بالکل صاف ہے۔ عبداللہ بن احمد ہی نہیں بلکہ ان کے اکابر تلامذہ کے دیکھنے والے بھی اب بہت کم رہ گئے۔ تکذیب کا خطرہ اب بہت زیادہ نہیں رہا، اسلئے ادھر ادھر مسند احمد کا ذکر کرنے لگے۔ چنانچہ خطیب بغدادی سے بھی انھوں نے اپنے سلسلے کا ذکر کیا، جیسا کہ ابن حجر نے خطیب کا قول نقل کیا ہے مگر خطیب جیسا نقاد، ابن المذہب کے دام تزویر میں کب آسکتا تھا۔ اگر واقعتہً خطیب کو ابن المذہب پر بھی اعتماد ہوتا، تو خطیب ضرور ابن المذہب سے سند کی سند و اجازت لے لیتے۔ خطیب ہی نہیں، بلکہ خطیب کے ہم عصر خدا جانے کتنے محدثین ابن المذہب سے مسند کی سند و اجازت لئے ہوتے۔ مگر کسی نے ان کے اس دعویٰ کی طرف توجہ نہ کی۔ بخوبی ممکن ہے کہ خطیب اور اس وقت کے دوسرے محدثین نے ابن المذہب کی تکذیب بھی کی ہو، مگر بعد والوں نے فقط مسند کا بھرم رکھنے کے لئے اس پر پردہ ڈال دیا، مگر عملی تکذیب پر کس طرح پردہ ڈالا جا سکتا ہے؟ اگر زبانی تکذیب کوئی ثبوت نہیں، تو یہ تو روز روشن کی طرح واضح ہے کہ خطیب اور اس وقت کے سارے محدثین نے عملی بے اعتنائی و بے توجہی سے درحقیقت انکی تکذیب کر کے دکھادی۔ ذہبی و ابن حجر زبانی تکذیب کا ذکر نہ کریں مگر اس عملی تکذیب کو آفتاب کی طرح چمک رہی ہے، کس طرح چھپا سکتے تھے، مگر زبانی تکذیب بھی ضرور تھی۔ جبھی تو ذہبی و ابن حجر باوجود توثیق مسند کی ضرورت کے ابن المذہب و قطیعی کو زبان روکتے روکتے بھی غیر متقن وغیرہ لکھ گئے۔

مختصر یہ کہ باوجود اس کے کہ یہ اپنے ہم عصر محدثین کے پاس مسند کو عمر بھر لئے پھرے مگر کسی نے کبھی توجہ نہ کی آخر دونوں اگلے مقتداؤں کی طرح یہ بھی صرف ایک شاگرد ابوالقاسم ہبتہ اللہ کو ڈھونڈ نکالنے میں کسی طرح کامیاب ہوئے اور مسند کی امانت انھیں کے سپرد کر کے ۴۴۴ھ میں دنیا سے سدھار گئے۔

ان ابوالقاسم ہبتہ اللہ صاحب کا بھی بالکل وہی ابن المذہب جیسا حال ہوا۔ ساری عمر مسند کو ہر جگہ ڈھوئے پھرے، مگر علمائے حدیث میں سے ایک شخص نے بھی نگاہ اٹھا کر انکی طرف نہ دیکھا۔ مجبوراً اپنے اسلاف کی طرح یہ بھی ایک غیر معروف شخص حنبل بن عبداللہ الرصافی کو اشاعتِ مسند کی خدمت کسی طرح تفویض کر گئے، چنانچہ حنبل عبداللہ الرصافی کے سوا اور کوئی شیخ ابوالقاسم ہبتہ اللہ یا کسی سے بھی مسند کا راوی نظر نہیں آتا۔ اگر کوئی ہے تو اس سے مسند کی کوئی اہمیت نہیں ثابت ہوتی۔ جس طرح حنبل بن عبداللہ الرصافی کے بعد دو چار راویوں کی تعداد مل جانے سے کوئی فائدہ نہیں، مگر اب تک رصافی کے سوا ہبتہ اللہ سے کوئی اور مسند کا روایت کرنے والا نظر سے نہیں گزرا۔

Marfat.com

مشتبہ آحاد روایتیں کبھی قابل قبول نہیں ہوتیں۔ محدثین کا متفقہ اصول ہے کہ کوئی ایسی روایت جس کے متعلق عقل اس کی مقتضی ہو کہ کسی خاص عہد یا ہر عہد میں اس کے جاننے والے اور اس کی روایت کرنے والے بہت کافی لوگ ہوں ایسی حدیث کو اگر اس خاص عہد یا ہر عہد میں صرف ایک ایک، یا ایک ہی راوی ایک دوسرے سے روایت کرتے چلے آرہے ہوں، تو وہ حدیث صرف احاد ہونے کی وجہ سے ظنی ہی نہیں کہی جائے گی، بلکہ موضوع یا مشتبہ ہونے کی حیثیت سے رد کر دی جائے گی۔

حدیث آحادِ ظنی اور آحادِ مشتبہ اور دونوں کا فرق۔ عہد صحابہؓ یا عہد تابعی یا عہد تبع تابعی میں کسی خاص کو صرف ایک ہی شخص اگر روایت کر رہا ہو تو وہ حدیث آحاد ہے۔ اگر تینوں زمانوں میں صرف ایک ہی ایک شخص روایت کرتا ہو، یا دو زمانوں میں، تو دہرے یا تہرے آحاد ہونے کی وجہ سے اسکی ظنی زیادہ قوی ہو کر اشتباہ سے قریب یا قریب تر ہوگی۔

مگر ایسی حدیث جس میں ایسی بات بیان کی جا رہی ہو، جس کے متعلق عقل اس کا یقین کرتی ہے کہ اس حدیث کے [illegible] والوں اور روایت کرنے والوں کی کچھ زیادہ تعداد ضرور ہونی چاہئے۔ مثلاً ایسا واقعہ [illegible] ایک جماعت کے سامنے کا ہے۔ امر یا نہی ہونے کی وجہ سے اس کا حکم پوری یا کسی خاص جماعت [illegible] پر اُس جماعت کا عمل درآمد ضرور ہونا چاہئے۔ ۲ کہا گیا ہو کہ اس کی اطلاع سب کو یا کسی خاص [illegible] ۳ کسی خاص جماعت یا عامۂ مسلمین کو مخاطب کیا گیا ہو۔ ۴ کسی خاص قبیلے یا جماعت کی تعریف میں وہ حدیث وارد ہوئی ہو۔ ۵ وہ واقعہ جو بیان کیا گیا ہے کوئی غیر معمولی ہو۔ تعجب خیزی کی وجہ سے [illegible] اور اعتبار سے۔ ۷ جو واقعہ مروی ہو وہ اپنی اہمیت کے اعتبار سے غیر معمولی ہو، وغیرہ ذالک۔

اس قسم کی روایت صرف کسی ایک ہی صحابیؓ سے مروی ہونا ضرور شبہ میں ڈالتا ہے [illegible] دوسرے صحابہ اس کے متعلق خاموش کیوں رہے اور تابعین نے اس کے متعلق کسی دوسرے صحابی سے کیوں نہیں دریافت کیا؟ اگر اسی ایک صحابی سے متعدد تابعی اور ہر تابعی سے متعدد تبع تابعین بھی روایت کرتے ہوں، جب بھی صرف ایک ہی صحابی سے اس کا مروی ہونا محل اشتباہ ضرور ہے۔ اسی طرح متعدد صحابہؓ سے صرف ایک ہی تابعی اگر روایت کر رہے ہوں، جب بھی وہ اشتباہ سے خالی نہیں۔ علیٰ ہذا القیاس اگر صحابہ و تابعی سب کا تعدد ہو، مگر سب سے صرف ایک ہی تابع تابعی روایت کر رہا ہو۔

اور اگر ایک صحابی سے ایک تابعی اور اس ایک تابعی سے کئی تبع تابعین روایت کر رہے ہوں تو یقیناً اشتباہ [illegible] ہونے کی وجہ سے موکد ہو جائے گا اور اگر ایک صحابی سے ایک تابعی اور اس ایک تابعی سے صرف ایک

۱ مثلاً صرف عورتوں یا صرف مردوں یا صرف جوانوں یا صرف بوڑھوں یا صرف مسافروں پر۔

Marfat.com

ہی تبع تابعی روایت کرے، جب تو ہر ے اشتباہ کی وجہ سے وہ روایت بہت زیادہ مشتبہ تر ہو جائے گی۔ اور ان تمام صورتوں میں اس قسم کی روائتیں اپنے مراتب اشتباہ کے مطابق مشتبہ ہونگی اور ان میں سے کوئی روایت بھی کسی بات میں بھی حجت و سند نہیں سمجھی جائے گی اور ضرور واجب الرد ہوگی، اس لئے کہ ہم کو تو قرآن مجید میں اتباع ظن اور اتباع ماتشابہ سے منع کیا گیا ہے اور یہ شان کفار و مشرکین اور گم راہوں کی بتلائی گئی ہیں۔ اسی لئے حدیث میں حکم ہے کہ وایاک والمشتبہات، یعنی مشتبہ باتوں سے سخت احتیاط کرو۔

تو جب دو ایک روایت جو اس طرح کی آحاد ہو، وہ مشتبہ ہو جاتی ہے اور اس کا یہ حال ہے تو پورا ذخیرہ جس میں تقریباً ساٹھ ہزار روایتوں کا انبار لگا ہوا ہے، یہ سارا دفتر مجھ کو کتابی صورت میں مجتمع ایسی بھیانک اور غیر معمولی احادیث سے سے پہنچتا ہے، جس کی آحادیت کا سلسلہ تین سو برس تک مسلسل متفرد و مشتبہ راویوں کی پانچ چھ روایتی پشتوں تک یکے بعد دیگرے بلا شرکت دیگرے و بے مداخلت غیرے چلا آرہا ہے اور تقریباً تین سو برس کے بعد بھی جو وہ آحاد ٹوٹتی ہے اور تعدد شروع ہوتا ہے، تو اس دور تعدد کا ہر راوی اس غیر معمولی احادیث کو تسلیم کئے ہوئے اور اس پر پوری طرح قائم ہی رہتا ہے۔ کوئی بھی اس غیر معمولی آحادیت کے پہاڑ سے ٹکراتے رہنے کے باوجود اسکے شیشۂ استقلال پر معمولی سے معمولی اور خفیف سے خفیف بال پڑنے کا گمان بھی کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ امام احمد کے صرف نام کی اُسی قسم کی ناروا ساحرانہ برکت ہے جیسی کہ سامری کو قبضۃ من اثر الرسول سے حاصل ہوئی تھی۔ وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون۔

منکرینِ حدیث

از ——— اسلم جیراجپوری

جب سے حدیثوں کی تدوین شروع ہوئی اسی وقت سے اہل علم کی ایک جماعت ایسی ہوتی چلی آئی ہے جو اس حیثیت کی منکر رہی۔ یعنی ان کے انکار کا مطلب یہ نہیں کہ وہ حدیث کے وجود یا اسکی حقیقت ہی کو نہیں مانتے بالکل جھوٹ جانتے ہیں بلکہ صرف یہ کہ اسکو دینی حجت نہیں تسلیم کرتے دین خالص انکے نزدیک سوائے قرآن کے کچھ نہیں۔ حدیث کو وہ صرف دینی تاریخ قرار دیتے ہیں جس سے عہد رسالت اور زمانہ صحابہ میں قرآن کی کیفیت معلوم ہوتی ہے۔ اور بس۔

امام شافعیؒ متوفی ۲۰۴ھ نے اپنی کتاب الام کی ساتویں جلد میں اس جماعت کا ذکر کیا ہے

Marfat.com

ایک کے ساتھ اپنی بحث کا بھی حال لکھا ہے اس نے امام موصوف سے سوال کیا جو مختصراً یہ تھا۔

"قرآن میں جو فرائض مسلمانوں پر عاید کئے گئے ہیں انمیں سے تم کسی کو عام قرار دیتے ہو کسی کو خاص اور کسی کو صرف مباح اور یہ سب کچھ اُن روایات کی بنیاد پر کرتے ہو جو اُن لوگوں سے مروی ہیں جنمیں سے اکثر کو نہ تم نے دیکھا نہ اُن سے ملے اور باوجود اسکے کہ ان رواۃ حدیث میں سے جنکی عدالت اور ثقاہت تمھارے نزدیک مسلّم ہے تم کسی کی نسبت یہ عقیدہ نہیں رکھتے کہ وہ غلطی، غلط فہمی، خطا اور نسیان سے بھی بری ہے پھر بھی ان کی روایتوں کو اس قدر برحق سمجھتے ہو کہ کتاب الٰہی کے احکام اور فرائض میں انکے ذریعے سے تفریق کر ڈالتے ہو"

امام صاحب نے اس کا جو جواب دیا اسکا خلاصہ یہ ہے کہ ان روایات سے سنت کی خبر صادق ہم تک پہنچتی ہے اور سنت وہی ہے جسکو قرآن نے "الحکمۃ" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔

لقد من اللہ علی المومنین اذ بعث فیھم رسولا من انفسھم یتلو علیھم آیاتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ ۲/۱۵۹	مومنوں پر اللہ نے احسان کیا جو انکے اندر انھیں میں سے ایک رسول کھڑا کر دیا جو انکو اللہ کی آیتیں سناتا، ان کا تزکیہ کرتا اور انکو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے۔

دوسری آیت ہے:۔

ما اٰتاکم الرسول فخذوہ وما نھاکم عنہ فانتھوا ۵۹/۷	رسول جو تمکو دے وہ لو اور جس سے روکے اس سے باز رہو۔

اس سے سنت کی دینی حیثیت ثابت ہے امام صاحب لکھتے ہیں کہ یہ سنکر اُس منکر نے اپنے قول سے رجوع کر لیا۔

حقیقت یہ ہے کہ ان دلیلوں سے اس منکر کے قائل کر دینے کو ہم امام شافعی کی کرامت ہی سمجھتے ہیں ورنہ ان سے اسکے سوال کے کسی حصہ کا بھی جواب نہیں ہوا کیونکہ اس کا اعتراض روایت اور ذریعہ خبر کے متعلق تھا کہ شبہ ہے اسلئے قرآن کی غیر مشتبہ آیات میں فیصلہ کرنے کے قابل نہیں۔ علاوہ بریں "الحکمۃ" سے جو لفظوں نے سنت مراد لی ہے کسی طرح صحیح نہیں۔ حکمت قرآن میں شامل و منزل من اللہ ہے جیسا کہ دوسری آیات میں صاف تصریح ہے۔

انزل اللہ علیک الکتاب والحکمۃ ۴/۱۱۳	اور اللہ نے تیرے اوپر کتاب و حکمت نازل کی۔

سورۂ بنی اسرائیل میں توریت کے احکام عشر کے مقابل احکام سبزدگانہ نازل کرنے کے بعد فرمایا ہے:۔

ذلک مما اوحی الیک ربک من الحکمۃ ۱۷/۳۹	یہ اس حکمت (دانشمندی) کی باتوں میں سے ہے جو تیرے رب نے تجھ پر وحی کی ہے۔

---

۱ حوالہ آیت کے ساتھ اوپر شمار سے کا ہے نیچے آیت کا۔

Marfat.com

خود اس منکر نے اعتراض کیا تھا۔ کہ

واذکرن ما یتلیٰ فی بیوتکن من آیات اللہ و الحکمۃ ۳۳/۳۴	تمھارے گھروں میں اللہ کی آیات اور حکمت جو تلاوت کی جاتی ہیں انکو یاد کرو۔

سے معلوم ہوا کہ "الحکمۃ" بھی قرآن ہی ہے ورنہ سنت کی کون تلاوت کرتا ہے مگر باوجود اسکے شافعی جیسے امام نے جو ائمہ مذہب میں نہایت ذہین اور قرآن کے ماہر تھے توجہ نہ کی اور اپنی ہی تفسیر پہ مصر رہے حالانکہ انکا خود قول ہے کہ سنت منزل من اللہ نہیں ہے بلکہ استنباطات نبویہ کا نام ہے پھر جب الحکمۃ کا قرآن سے منزل من اللہ ہونا ثابت ہے تو وہ سنت کیسے ہوسکتی ہے۔

دوسری آیت "ما آتاکم الرسول" مال فیئ کی تقسیم کے متعلق ہے اسکو سنت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

امام شافعی کی ان دونوں دلیلوں کو نجدی اور اہلحدیث علماء آجتک سنت کے ثبوت میں پیش کیا کرتے ہیں اور کبھی یہ غور کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے کہ ان آیات کا اصل مفہوم کیا ہے۔

شیخ طاہر جزائری نے بھی اپنی کتاب توجیہ النظر الیٰ اصول الاثر میں منکرین کا ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:۔

وقد ثبت توقف کثیر من الصحابۃ فی قبول کثیر من الاخبار وقد استدل بذالک من یقول بعدم الاعتماد علیھا فی الدین	بہت سی حدیثوں کے قبول کرنے میں بہت سے صحابہ کا توقف کرنا ثابت ہوچکا ہے اس سے وہ لوگ دلیل پکڑتے ہیں جو دین میں حدیثوں پر اعتماد نہ کرنے کے قائل ہیں۔

الغرض منکرین حدیث کی ایک جماعت اسلام میں رہی ہے مگر انکا کوئی جداگانہ فرقہ کبھی نہ تھا بلکہ یہ ارباب فکر میں سے وہ لوگ تھے جو غور کرتے کرتے اس حقیقت تک پہنچ گئے کہ حدیثیں دینی حیثیت نہیں رکھتیں اصل دین قرآن ہی ہے۔

ان منکرین کے اقوال و افکار کا میں نے مطالعہ کیا ہے اور انکے دلائل و براہین دیکھے ہیں جو اس کثرت سے ہیں کہ انکے لکھنے کیلئے ایک ضخیم دفتر درکار ہے اسلئے میں انکی جملہ فروعی باتوں کو چھوڑ کر صرف سات اصولی دلائل اپنے الفاظ میں اختصار کے ساتھ لکھتا ہوں۔

قائلین حدیث کو انکا جواب یا حدیث کی دینی حیثیت کا ثبوت قرآن ہی سے دینا چاہیئے کیونکہ مدعی فریقین کی مسلم کتاب ہے۔ جو آیات سند میں لکھی جائیں انکی تفسیر بھی آیات ہی سے ہونی چاہیئے نہ کہ روایات سے

(۱) گزشتہ رسولوں کی امتوں کو اللہ تعالیٰ نے آسمانی کتاب ہی پر ایمان رکھنے کا حکم دیا تھا اور ہم کو بھی یہی حکم دیا ہے۔

قولوا منا باللہ وما انزل الینا الایہ ۲/۱۳۶	کہو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس چیز پر جو ہماری طرف

Marfat.com

آمن الرسول بما انزل الیه من ربه والمومنون ۲/۲۸۵	رسول ایمان لایا اس چیز پر جو اسکے رب کی طرف سے اتاری گئی اور مومنین بھی۔
وقل آمنت بما انزل اللہ من کتاب ۴۲/۱۵	اور کہدے کہ میں ایمان لایا اسپر جو اللہ نے اتارا یعنی کتاب

اس کثرت سے آیات ہیں جن کا شمار مشکل ہے اور سارے قرآن میں شروع سے آخر تک کتاب اللہ کے سوا کسی سنت اور کسی حدیث پر ایمان رکھنے کا مطلق حکم نہیں ہے بلکہ ممانعت نکلتی ہے۔

فبای حدیث بعدہٗ یومنون ۷/۱۸۵	اس (قرآن) کے بعد وہ کس حدیث پر ایمان لائینگے؟
فبای حدیث بعد اللہ وآیاتہ یومنون ۴۵/۵	اللہ اور اسکی آیتوں کے بعد وہ کس حدیث پر ایمان لائینگے؟

زیادہ تصریح اس آیت میں ہے:۔

ومن الناس من یشتری لھو الحدیث لیضل عن سبیل اللہ بغیر علم ویتخذھا ھزوا۔ اولئک لھم عذاب مھین ۳۱/۶	بعض آدمی وہ ہیں جو حدیث کے شغلہ کے خریدار ہوتے ہیں تاکہ لوگوں کو اللہ کی راہ سے بھٹکا دیں بلا علم (یقین) کے۔ اور اسکو مذاق بنالیں یہ لوگ ہیں جنکے لئے خوار کرنے والا عذاب ہے۔

اس آیت میں "لھو الحدیث" کے لفظ کی تفسیر ائمہ حدیث نے غنا کی ہے یعنی گانا۔ اور اسکی روایت حضرت ابن عباس تک پہنچائی ہے۔ مجھے تعجب ہے کہ پھر اللہ کو غنا کہنے میں کیا دشواری تھی حقیقت یہ ہے کہ یہ تفسیر کسی طرح صحیح نہیں کیونکہ اس آیت میں لھو الحدیث کی دو صفتیں بیان کی گئی ہیں ایک تو یہ کہ وہ لوگوں کو گمراہ کرنے والی ہے دوسری یہ کہ اس کی بنیاد علم پر نہیں ہے۔ غنا کی غرض نشاط و طرب ہے۔ اس کا مقصد نہ گمراہ کرنا ہے نہ اللہ کی مذاق بنانا ہے اور نہ اسکو علم یعنی یقین یا غیر یقین سے کوئی تعلق ہے صرف قصص اور روایات ہی ہیں جو لھو الحدیث بنائے کہا گیا ہے کہ رسول پر بھی تو ایمان لانے کا حکم قرآن میں ہے اسلئے اسکے اقوال و اعمال جنکا نام حدیث ہے خود بخود جزو ایمان بنگئے۔ جواب دیا گیا ہے کہ بیشک ہمارے رسول بلکہ جملہ رسولوں پر ایمان لانا فرض ہے۔

لا نفرق بین احد من رسلہ ۲/۲۸۶	اللہ کے رسولوں میں سے کسی ایک کے درمیان بھی ہم فرق نہیں کرتے (ایمان لانے میں)

مگر ساری بحث تو یہی ہے کہ رسول کا پیغام امت کے لئے قرآن ہے یا حدیث۔ رسول پر قرآن نازل کیا گیا اسی کی اتباع۔ اسی کی تلاوت، اسی کی تبلیغ اور اسی کی تعلیم کا حکم دیا گیا۔ رسول نے اسی کو سنایا۔ اسی کو لکھوایا اسی کو یاد کرایا اور اسی پر عمل کیا، اسکے اتارنے والے نے اسکی حفاظت کا بھی ذمہ لے لیا۔ کیا حدیثوں کے لئے ان میں سے کوئی ایک بات بھی ثابت کرسکتے ہو؟ حدیثوں کی کیفیت تو یہ ہے کہ جس نے جو دیکھا یا سنا اسکو بیان کرنا شروع کردیا۔ یہی باتیں سلسلہ بہ سلسلہ امت میں پھیلیں ایک زمانے کے بعد تم نے اصول مقرر کئے ان میں سے کسی

Marfat.com

کو قابلِ تسلیم قرار دیا اور کسی کو مسترد قرار دیا۔ کیا جن حدیثوں کو تم نے تسلیم کیا ہے انکے اوپر کوئی آسمانی مہر ہے یا خود رسول کے سامنے پیش کرکے انکی تصدیق کرالی گئی ہے؟ پھر کس طرح انکو جزوِ ایمان یا واجب التسلیم کہنے کا حق رکھتے ہو درانحالیکہ وہ اصول بھی جنکے اوپر حدیث کی صحت کا دارومدار تم نے رکھا ہے یعنی صحت کی ضمانت سے قاصر ہیں۔ رسول اللہ نے صرف قرآن ہی پر عمل کیا ہے اور بحیثیت رسالت وہی اُمت کے لئے انکا پیغام ہے۔

واوحی الی هٰذا القرآن لانذرکم به ومن بلغ ۶/۲۰	مجھ پر یہ قرآن وحی کیا گیا کہ اس سے تم کو آگاہ کروں اور جن تک بھی یہ پہنچے۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ اطاعت رسول قرآن میں مامور بہ ہے۔

اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم فان تنازعتم فی شی فردوہ الی اللہ والرسول ۴/۶۲	اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول اور امیروں کی جو تم میں سے ہوں۔ اگر کسی معاملہ میں تم آپس میں جھگڑ بیٹھو تو اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ۔

اور جب اطاعت رسول فرض ہے تو لازم ہے کہ اسکے اقوال واعمال جمع کئے جائیں تاکہ امت کو اسکی اطاعت کرے۔

اگر یہ استدلال صحیح ہے تو اسلام میں جسقدر امرار ہوئے ہیں۔ ان میں سے بھی ہر ایک کا ایک ایک حدیث ہونا چاہئے ورنہ ان کی اطاعت کیسے ہوگی۔ کیونکہ ایک ہی لفظ "اطیعوا" ہے۔ جس میں رسول اور امرار دونوں داخل کئے گئے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ رسول کی اطاعت باذن الٰہی اور بحیثیت رسالت فرض ہے جیسا کہ اللہ نے کہا ہے

وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ ۴/۶۴	ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اسی لئے کہ باذن الٰہی اسکی اطاعت کرے بلکہ چونکہ رسول اللہ ہی کا پیغام لاتے ہیں اور اسی کی اطاعت چاہتے ہیں اسلئے ان کی اطاعت اللہ کی اطاعت کرے۔
ومن یطع الرسول فقد اطاع اللہ ۴/۸۳	جو رسول کی اطاعت کرے اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

لیکن اطاعت رسول سے عملی اور بالمشافہ اطاعت مراد ہے۔ اسکے لئے دفاتر تیار کرنے کی ضرورت نہیں قرآن کریم میں اس کی تصریح ہے۔

یا ایها الذین آمنوا اطیعوا اللہ ورسولہ ولا تولوا عنه وانتم تسمعون ۸/۲۰	اے مومنو اللہ اور اسکے رسول کی اطاعت کرو اس سے منہ نہ موڑو جب کہ تم سن رہے ہو۔

یہ سوال کہ رسول کے بعد کس طرح اس کی اطاعت ہوگی اولوالامر کی اطاعت کیسے ہوگی اور

جانشینی کریں گے۔

آیت کے دوسرے ٹکڑے یعنی بصورت تنازع معاملہ کو رسول کیطرف رد کرنے کے حکم سے حدیث کے بعض حامی اسکی دینی حیثیت کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ لیکن انھوں نے یہ نہیں سوچا کہ اس صورت میں رسول کو کیا کرنے کا حکم ہے۔ سنئے۔

فاحکم بینھم بما انزل اللہ ۵/۵۰	ان کے درمیان قرآن کے مطابق فیصلہ کرو۔
انا انزلنا الیک الکتاب بالحق لتحکم بین الناس بما اراک اللہ ۴/۱۰۶	ہم نے تیری طرف قرآن اُتارا حق کے ساتھ کہ جو اللہ تجھ کو سمجھائے اسکے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو۔

دراصل حکم کتاب اللہ ہی ہے رسول یا امیر اسی سے اپنی فہم کے مطابق فیصلہ کرنے پر مامور ہیں اسی لئے فرمایا:۔

ان اختلفتم فی شئی فحکمہٗ الی اللہ ۴۲/۸	اگر تم کسی بات میں اختلاف کرو تو اسکا فیصلہ اللہ کیطرف ہے۔

اللہ کے فیصلہ کے معنی یہ ہیں کہ اسکی کتاب کی رُو سے فیصلہ کیا جائے۔

افغیر اللہ ابتغی حکما وھو الذی انزل الیکم الکتاب مفصلا ۶/۱۱۵	کیا اللہ کے ماسوا کوئی حکم تلاش کروں اور وہ تو وہ ہے جس نے تمھاری طرف مفصل کتاب اُتاری۔
ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الفاسقون ۵/۵۲	جو اللہ کی کتاب کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہ فاسق ہیں۔

(۲) اتباع کے متعلق اللہ تعالےٰ کا قطعی حکم یہ ہے:۔

اتبعوا ما انزل الیکم من ربکم ولا تتبعوا من دونہ اولیاء ۷/۳	اسکی پیروی کرو جو تمھاری طرف تمھارے رب کے یہاں سے اُتارا گیا اور اسکے سوا اولیاء کی پیروی نہ کرو۔

اس آیت میں حصر ہے کہ قرآن ہی کی پیروی کرو اور اسکے سوا کسی دوسرے کی پیروی نہ کرو۔ درحقیقت یہ آیت اس امر میں نص صریح ہے کہ بجز کتاب اللہ کے کسی کی پیروی جائز نہیں۔

کہا جا سکتا ہے کہ اسی قرآن میں رسول کی اتباع کا حکم بھی دیا گیا ہے:۔

قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی ۳/۲۹	کہدے کہ اگر تم کو اللہ سے محبت ہے تو میری پیروی کرو۔

لیکن خود رسول کو کس کی اتباع کا حکم دیا گیا ہے؟ اسکی بھی تصریح قرآن میں ہے:۔

اتبع ما اوحی الیک من ربک ۶/۱۰۶	پیروی کر اسکی جو تیرے رب کے پاس سے تیری طرف وحی کی گئی۔

پھر رسول کو اعلان کر دینے کا حکم دیا جاتا ہے:۔

قل انما اتبع ما یوحی الی من ربی ۷/۲۰۳	کہدے کہ میں تو بس اُسی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے رب کے پاس سے میری طرف وحی آتی ہے۔

لہٰذا رسول بجز وحی کے کسی چیز کا پیرو نہیں تھا اسلئے اسکی پیروی بعینہٖ قرآن کی پیروی ہے۔

Marfat.com

یہ خیال کہ رسول اللہ کی زبان مبارک سے جو کچھ نکلتا تھا سب وحی تھا۔ جس کے ثبوت میں آیت

ما ینطق عن الھوا ان ھو الا وحیٌ یوحیٰ	وہ نفس کی خواہش سے نہیں بولتا۔ وہ تو صرف وحی ہے جو اس
۵۳/۴	پر بھیجی جاتی ہے۔

پیش کیجاتی ہے صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ کفار کو جو انکار تھا وہ قرآن کے متعلق تھا اُسی کے بارے میں اللہ نے فرمایا کہ وہ وحی ہے۔ رسول اللہ کی عام گفتگو جو گھر میں یا لوگوں کے ساتھ ہوتی تھی اسکے متعلق نہ کوئی انکار تھا نہ کوئی بحث تھی۔

چنانچہ دوسری آیات میں تصریح ہے کہ وحی قرآن ہی ہے :۔

واتل ما اوحی الیک من کتاب ربک ۱۸/۲۷	اور پڑھ کر سنادے جو وحی کیگئی ہے تیری طرف یعنی اپنے رب کی کتاب۔
واوحی الی ھذا القرآن لانذرکم بہ ومن	اور میری طرف یہ قرآن وحی کیا گیا ہے تاکہ میں تمکو اس کے
بلغ ۶/۲۰	ذریعہ سے آگاہ کروں اور انکو بھی جن تک وہ پہنچے۔
قل انما انذرکم بالوحی ۲۱/۴۷	کہدے کہ میں تو صرف وحی کے ذریعہ سے آگاہ کرتا ہوں۔

حصر ہے کہ سرمایۂ انذار قرآن ہی ہے۔ اور وہی قرآن لوگوں کو آگاہ کرنے کے لئے مجھ پہ وحی کیا گیا ہے۔

جو لوگ وحی کی دو قسمیں قرار دیتے ہیں۔ متلو اور غیر متلو جن میں پہلی کو قرآن اور دوسری کو حدیث کہتے ہیں وہ محض انکی خیالی تقسیم ہے بعضوں نے وحی کی دو قسمیں خفی اور جلی ہیں لیکن ہمارے رسولؐ کی وحی تو سب خفی تھی۔ وحی کی کیفیت خود قرآن میں کئی جگہ بیان کی گئی ہے۔

نزل بہ الروح الامین علیٰ قلبک ۲۶/۱۹۵	روح الامین اسکو لے کر تیرے قلب پر اُترا ہے۔

(۳) قرآن خالص اور دائمی حق ہے۔

ویری الذین اوتوا العلم الذی انزل الیک	اور اہل علم جانتے ہیں کہ جو کچھ تیرے رب کی طرف سے تجھ پر
من ربک ھو الحق ۳۴/۶	اُترا ہے۔ وحی حق ہے۔

یقینی ہے اور ہر قسم کے شک و شبہ سے پاک ہے۔

ذالک الکتاب لا ریب فیہ ۲/۲	یہ کتاب ہے جس میں کسی قسم کا شک نہیں۔

روح الامین اسکو لاتا ہے اور رسول امین پر اُتارتا ہے۔ شہاب ثاقب کے پہرے لگادئے جاتے ہیں تاکہ کسی قسم کی شیطانی آمیزش نہ ہوسکے چنانچہ وہ جن جنھوں نے قرآن سنا کہتے ہیں :۔

کنا نقعد منھا مقاعد للسمع فمن یستمع الان یجد لہ	ہم بیٹھا کرتے تھے سننے کے ٹھکانوں پر مگر اب جو سننا چاہے
شھابا رصدا ۷۲/۹	شہاب کو اپنی تاک میں پاتا ہے۔

اُتارنے کے بعد اللہ تعالیٰ نبی کو اسکے خود پڑھانے اور یاد کرانے کا ذمہ لیتا ہے۔

Marfat.com

انا علینا جمعہٗ وقرآنہٗ ۷۵/۱۸ | یقیناً ہمارا ذمہ ہے کہ ہم اسکو یاد کرادینگے اور پڑھا دینگے۔

اسبات کی بھی ذمہ داری لیتا ہے کہ یاد کرادینے کے بعد تم اسکو بھولوگے نہیں.

سنقرئک فلا تنسیٰ ۸۷/ | ہم تمھیں پڑھا دینگے پھر تم اسکو نہ بھولوگے۔

پھر اس کتاب کی ابد تک حفاظت کرنے کا اعلان کرتا ہے۔

انا نحن نزلنا الذکر وانا لہٗ لحافظون ۱۵/۱۰ | ہم ہیں کہ ہم نے قرآن کو اُتارا اور ہم ہیں کہ اسکے نگہبان ہیں.

وہ اسکے لفظ لفظ کا محافظ ہے کسی کی مجال نہیں کہ اسکے کلمات کو بدل سکے۔

واتل ما اوحی الیک من کتاب ربک لامبدل لکلماتہٖ ولن تجد من دونہٖ ملتحدا ۱۸/۲۷ | اور سُنا جو کچھ تیری طرف وحی کیگئی ہے یعنی اپنے رب کی کتاب کوئی اسکے کلمات کو بدلنے والا نہیں اور اسکے سوا ہرگز تجھے کوئی پناہ نہیں ملیگی۔

اور حدیثیں بجز متواتر[1] کے جسکے وجود ہی میں بحث ہے باتفاق ائمہ حدیث تمام تر ظنی ہیں۔ امام غزالی لکھتے ہیں:۔

خبر الواحد لا یفید العلم (المستصفےٰ جزو اول ص۱۳۰) | خبر واحد یقین کا فائدہ نہیں دیتی۔

خبر واحد کی تعریف بھی اسی میں ہے:۔

انا نرید بخبر الواحد فی ھذا المقام ما لا ینتھی من الاخبار الی حد المتواتر المفید للعلم فما نقلہ جماعۃ من خمسۃ او ستۃ مثلاً فھو خبر الواحد | ہم اس مقام پر خبر واحد سے وہ خبر مراد لیتے ہیں جو حد متواتر تک جو مفید یقین ہے نہ پہنچے مثلاً جس خبر کو ایک جماعت ۵-۶ آدمیوں سے روایت کرے وہ خبر واحد ہے۔

اور اللہ تعالیٰ ظن کا روادار نہیں۔

وان تطع اکثر من فی الارض یضلوک عن سبیل اللہ ان یتبعون الا الظن وان ھم الا یخرصون ۶/۱۱۷ | روئے زمین کے اکثر لوگ ایسے ہی ہیں کہ اگر تو انکی [illegible] اللہ کی راہ سے گمراہ کردینگے وہ تو صرف ظن کی پیروی کرتے ہیں اور صرف اٹکل دوڑاتے ہیں۔

وما یتبع اکثرھم الا ظنا ان الظن لا یغنی من الحق شیئا ۵۳/۲۸ | اکثر ان میں سے نہیں پیروی کرتے مگر ظن کی اور ظن حق کا کچھ کام نہیں دے سکتا۔

ولا تقف ما لیس لک بہ علم ۱۷/۳۶ | اور اسکے پیچھے نہ چل جسکا تجھکو علم نہیں۔

اسلئے حدیثیں دینی امور میں کارآمد نہیں صرف تاریخ دین کا کام دے سکتی ہیں۔

---

[1] بعض حدیثوں کی بابت بعض علما، حدیث نے تواتر لفظی کا دعویٰ کیا ہے [illegible] نہیں ہے اور انکا تواتر بھی فقط ظہور میں آیا بلکہ اتفاقی ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ ایک حدیث بھی متواتر موجود نہیں

Marfat.com

(۴) سرچشمہ دین اللہ ہی ہے :۔

شرع لکم من الدین ما وصّٰی بہ نوحاً والذی اوحینا الیک ۴۲/۱۲	اللہ نے تمھارے لئے وہی دین شروع کیا جسکی وصیت اس نے نوحؑ کو کی تھی اور جسکو ہم نے تیری طرف وحی کیا۔

یعنی اوّلین رسل حضرت نوحؑ سے خاتم رسل محمدؐ تک وہی دین ہے جو اللہ نے مشروع کیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے :۔

ثم جعلناک علیٰ شریعۃ من الامر فاتبعھا ۴۵/۱۸	پھر ہم نے تجھکو (عالم[1]) امر کی شریعت پر لگادیا ہے اسی کی اتباع کر۔

قرآن اتارکر اس نے اپنے دین کو مکمل کر دیا اور اعلان فرمایا۔

یا ایھا الناس قد جاءکم برھان من ربکم وانزلنا الیکم نوراً مبینا۔ فاما الذین آمنوا باللہ واعتصموا بہ فسید خلھم فی رحمۃٍ منہ وفضلٍ ویھدیھم الیہ صراطاً مستقیما ۵/۱۷۵	لوگو! تمھارے پاس رب کیطرف سے دلیل آگئی اور ہم نے نور مبین تمھاری طرف اُتار دیا اب جو اللہ پر ایمان لائے اور جنھوں نے اسکو مضبوط پکڑ لیا تو وہ انکو اپنی رحمت اور مہربانی میں داخل کریگا اور اپنی طرف سیدھے راستہ کی ہدایت دیگا۔

یہی نور مبین یعنی قرآن ہے جسکی روشنی میں نبیؐ خود چلتا تھا اور دوسروں کو چلاتا تھا اسی آفتابِ حقیقت نے اسکے افق قلب پر طلوع ہوکر اسکو سراج منیر بنالیا تھا یہی اسکا سرمایۂ تعلیم و تبلیغ اور سامان بشارت و انذار تھا اسی سے وہ لوگوں کا تزکیہ کرتا یعنی انکو کفر و شرک کی ظلمت سے نکالکر اسلام اور صراط مستقیم کی روشنی میں لاتا تھا۔

کتاب انزلناہ الیک لتخرج الناس من ظلمٰت الی النور ۱۴/۱	کتاب ہم نے تیری طرف اتار دی ہے کہ تو لوگوں کو تاریکی سے روشنی میں نکال لائے۔

اسی کی تلاوت کرتا، اسی کو سناتا، اسی کو لکھاتا، اسی کو یاد کرتا، اسی کو سکھاتا اور اسی پر عمل کرکے امت کیلئے نمونہ قائم کرتا۔

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ ۳۳/۲۱	تمھارے لئے رسول اللہ کے اندر اچھا نمونہ ہے۔

چنانچہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، نکاح و طلاق، جنگ و صلح وغیرہ تقریباً جملہ اوامر و نواہی کتاب پر عمل کرکے طریقہ

---

[1] عالم امر جسکے ماتحت عالم خلق میں جملہ طبیعی اور حیاتی حرکات کا صدور ہوتا ہے قرآن کی تعلیمات مہمہ میں سے ہے اسکے سمجھ لینے سے عرش، ملائکہ، روح

دین اور شریعت وغیرہ کے حقائق واضح ہوجاتے ہیں لیکن یہ مسئلہ بھی دیگر اہم قرآنی مسائل کیطرح مسلمانوں میں محروم توجہ رہا جسکی وجہ سے بہت سے اختلافات اور نزاعیں واقع ہوئیں منجملہ انکے فتنہ خلق قرآن تھا جسمیں علماء و صلحاء مصیبت میں ڈالے گئے خاصکر امام احمد حنبل جیسے بزرگ ۲۸ مہینے تک قید و ضرب کی سخت اگر اسوقت عالم امر کی حقیقت واضح ہوتی تو فریقین کو اپنی اپنی غلطی کا علم ہوجاتا اور نزاع نہ ہوتی نہ علماء کو ضرورت پڑتی کہ قرآن کو غیر مخلوق اور قدیم کیلئے حدیثیں بنائیں کیونکہ اس رسول اعظم و مہبط وحی سے جسکی رسائی افق اعلیٰ تک تھی اور جو بچشم بصیرت سے صاف دیکھ رہا تھا کہ وحی کا ہے جو سراسر حادث ہے قطعاً ناممکن تھا کہ اسکو قدیم کہدے اسی طرح استوا علی العرش کی بحث ہے جو صدیوں ہی نہیں بلکہ آجتک ہے

Marfat.com

بتادیا جو امت میں نسلاً بعد نسلٍ متواتر متوارث چلا آرہا ہے۔

یہاں یہ سوال ہوسکتا ہے کہ جب تعامل امت جو تواتر کیساتھ چلا آرہا ہے تمھارے نزدیک یقینی اور دینی ہے تو پھر حدیثوں کے دین ہونے میں کیا قباحت ہے آخر وہی اعمال تو ہیں جو دفاتر حدیث میں مدون کئے گئے ہیں۔

جواب یہ ہے کہ دونوں ایک نہیں ہیں بلکہ تعامل اور حدیث میں آسمان وزمین کا فرق ہے۔ تعامل یقینی ہے اور حدیث ظنی، تعامل احکام قرآن پر عمل کی صورت ہے اور حدیث اس سے دس گنی بلکہ سوگنی باتیں زیادہ شامل رکھتی ہیں اور قرآنی حدود سے آگے بڑھ کر زندگی کے ہر شعبہ میں انسانیت کو ایسے امور کی پابند بناتی ہیں جو صرف ہنگامی یا مقامی ہوسکتے ہیں مثلاً قرآن نے وضع اور لباس میں انسان کو آزاد چھوڑا ہے اور اسلام جیسے عالمگیر فطرتی دین کو جو ہر ملک اور ہر قوم کو اپنے جھنڈے کے نیچے لانا چاہتا ہے ایسا ہی وسیع ہونا بھی چاہئے مگر حدیثیں مسلمان کے لئے ایک مخصوص ہیئت اور وضع معین کرتی ہیں انھوں نے بال بال تک جکڑ رکھا ہے کہ اسکو چھوڑو اور اسکو منڈاؤ بعض جگہ وہ قرآن کے بالکل خلاف جاتی ہیں جنکی وجہ سے علمار قطعی اور حکمی آیات کو منسوخ کرنے لگتے ہیں۔ مثلاً اللہ نے مالدار مسلمان پر مرنے سے پہلے والدین اور اقربا کے لئے وصیت فرض کی ہے۔

کتب علیکم اذا حضر احدکم الموت ان ترک خیراً الوصیة للوالدین والاقربین بالمعروف حقاً علی المتقین ۲/۱۷۷	تمھارے اوپر فرض کیا گیا ہے کہ جب تم میں سے کسی کو موت آجائے اور وہ مال چھوڑے تو والدین اور اقربا کے لئے دستور کے مطابق وصیت کرجائے۔ اہل تقویٰ پر یہ ایک حق ہے۔

مگر حدیث کہتی ہے:۔ لاوصیة لوارثٍ | کسی وارث کے لئے وصیت نہیں۔

علمار نے اس ظنی حدیث کیوجہ سے وہ یقینی وصیت جو اللہ نے بہت سے عائلی مصالح کے لحاظ سے فرض کی ہے اور جسکو اہل تقوی پر ایک حق قرار دیا ہے منسوخ کرڈالی۔

حدیثوں کا تو یہ حال ہے کہ جو روایات قرآن کی تفسیر میں ہیں وہی خود بعض جگہ اسکے برخلاف ہیں۔ مثلاً

ولقد آتینا موسیٰ تسع آیات بینات الایه ۱۷/۱۰۲	ہم نے موسیٰ کو نو کھلی کھلی نشانیاں دیں۔

اس کی تفسیر حدیث کی زبان سے سنئے:۔

صحیح احادیث میں مذکور ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلعم تشریف فرما تھے سامنے دو یہودی آرہے تھے انھوں نے کہا "چلو اس پیغمبر سے کچھ سوال کریں" دوسرے نے کہا پیغمبر نہ کہو سن لیگا تو اسکی چار آنکھیں ہوجائیں گی (یعنی خوش ہوگا) اسکے بعد وہ آپؐ کی خدمت میں گئے اور دریافت کیا کہ موسیٰ کو نو آیتیں کون سی دی گئیں تھیں۔ آپؐ نے فرمایا وہ یہ ہیں کہ کسی کو شریک نہ بناؤ۔ زنا نہ کرو۔ کسی بیگناہ کو قتل نہ کرو۔ چوری نہ کرو۔ جادو نہ کرو۔ کسی حاکم کے پاس بیجرم کی چغلی نہ کھاؤ۔ سود نہ کھاؤ کسی پاک دامن پر تہمت نہ لگاؤ اور میدان جہاد سے نہ بھاگو (اس نویں حکم میں راوی کو شک ہے) اور خاص تمھارے

Marfat.com

لئے اے یہود یہ دسواں حکم ہے کہ سبت کے دن زیادتی نہ کرو[۵۱]۔ یہ سنکر دونوں یہودیوں نے آپؐ کے دست و پا کو بوسہ دیا[۵۲]۔

حضرت موسیٰ کی تسع آیات کی تفسیر توریت کے احکام تسعہ کے ساتھ جو اس حدیث میں کیگئی ہے نہ صرف یہ کہ صحیح نہیں بلکہ قرآن کی رو سے اسکا صحیح ہونا قطعاً محال ہے کیونکہ حضرت موسیٰ کو یہ نو نشانیاں اسوقت ملیں جب مدین سے مصر جاتے ہوئے اللہ نے انکو رسول بنا کر فرعون کیطرف بھیجا اور اسوقت تک توریت نازل ہی نہیں ہوئی تھی۔

ان دونوں باتوں کی تصریح قرآن میں موجود ہے۔ خود آیت مذکورہ۔

ولقد آتینا موسیٰ تسع آیات بینات (فاسئل بنی اسرائیل) اذ جاءھم. فقال لہ فرعون انی لاظنک یا موسیٰ مسحورا۔ قال لقد علمت ما انزل ھؤلاء الا رب السموٰت والارض بصائر۔ ۱۷/۱۰۲	موسیٰ کو ہم نے کھلی کھلی نو نشانیاں دیں (تو بنی اسرائیل سے پوچھ لے) جب وہ انکے پاس آیا تو فرعون نے اس سے کہا کہ اے موسیٰ میں خیال کرتا ہوں کہ تجھ پر جادو کیا گیا ہے۔ اس نے کہا تو جانتا ہے کہ انکو نہیں اتارا آسمان اور زمین کے رب نے مگر نشانیاں۔

سے ثابت ہے کہ یہ نشانیاں لیکر موسیٰ فرعون ہی کے پاس گئے تھے۔ مزید تصریح سورۂ نمل میں ہے :۔

فی تسع آیاتٍ الی فرعون و قومہ	نو نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اسکی قوم کی طرف۔

سورۂ اعراف میں جہاں حضرت موسیٰ کا قصہ مسلسل بیان کیا گیا ہے ان نشانیوں کی تفصیل کردی گئی ہے :۔

فالقیٰ عصاہ فاذا ھی ثعبان مبین ونزع یدہ فاذا ھی بیضاء للناظرین ۷/۱۰۵	موسیٰ نے اپنا عصا ڈالا وہ کھلا ہوا اژدھا ہوگیا اور اپنا ہاتھ نکالا۔ وہ دیکھنے والوں کے لئے سفید تھا۔
ولقد اخذنا آل فرعون بالسنین و نقصٍ من الثمرات ۷/۱۳۸	آل فرعون کو ہم نے قحط اور پھلوں کی کمی میں گرفتار کیا۔
فارسلنا علیھم الطوفان والجراد والقمل و الضفادع والدم آیاتٍ مفصلاتٍ ۷/۱۳۱	پھر ہم نے بھیجا طوفان۔ ٹڈی۔ چچڑیاں۔ مینڈک اور خون الگ الگ نشانیاں۔

اس تفصیل کے مطابق وہ نو نشانیاں جو حضرت موسیٰ کو دی گئی تھیں یہ ہوئیں :۔

عصا۔ ید بیضا۔ قحط۔ نقص ثمر۔ طوفان۔ ٹڈی۔ جوں۔ مینڈک۔ خون۔

---

[۵۱] نہ صرف دسواں بلکہ توریت کے احکام عشرہ کل کے کل یہود کے لئے تھے۔ توریت دینے کے بعد حضرت موسیٰ کو اللہ نے حکم دیا۔ قوملک ماخذوا باحسنھا یعنی اپنی قوم کو حکم دے کہ انکو بہترین طریقے سے لیں۔

[۵۲] یہ حدیث جامع ترمذی۔ مسند احمد۔ نسائی۔ ابن ماجہ۔ ابن جریر میں ہے امام ترمذی نے اس حدیث کو متعدد جگہ ہے ایک تفسیر بنی اسرائیل میں اور دوسری "باب ماجاء فی قبلۃ الید والرجل" دوسری جگہ کہا ہے کہ "حدیث حسن" (سنن النبی مجلد سوم طبع دوم صفحہ ۱۱۵)

Marfat.com

اسکے مدتوں بعد فرعون ہلاک کئے جاتے ہیں اور حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو لئے ہوئے طور ایمن کیطرف پہنچتے ہیں وہاں اللہ تعالیٰ انکو توریت عطا کرتا ہے۔

یاموسیٰ انی اصطفیتك علی الناس برسالاتی و بکلامی فخذ ما اتیتك وکن من الشاکرین وکتبنا لہٗ فی الالواح من کل شی موعظة وتفصیلا لکل شی	اے موسیٰ میں نے تجھ کو لوگوں پر اپنی پیغمبری اور کلام کیلئے چُن لیا۔ میں تجھ کو دیتا ہوں لے اور شکر ادا کر اور ہم نے اس کے لئے تختیوں پر ہر قسم کی نصیحت اور ہر شے کی تفصیل لکھدی۔

۷/۱۴۲

یہ تمام تفصیلات اسقدر مصرح ہیں کہ ان میں نہ کسی شک کی گنجائش ہے نہ کسی تاویل کی مگر پھر بھی انکے خلاف یہ "چار آنکھوں والی" حدیث جو صحاح ستہ کی ہے بتلاتی ہے کہ خود رسولؐ نے تسع آیات کی تفسیر توریت کے احکام تسعہ کے ساتھ کی۔ کوئی عقل اسکو تسلیم کرسکتی ہے؟ چنانچہ بعض مفسرین نے باوجود حدیث مذکورہ کے بھی یہ تفسیر قبول نہیں کی اسی پر یہ معاملہ ختم نہیں ہوجاتا بلکہ چونکہ ان یہودیوں نے خوش ہوکر آنحضرتؐ کے دست و پا کو بوسہ دیا تھا اسلئے صحیح میں ایک باب "قبلة الید والرجل" کا اضافہ اور ہوجاتا ہے جس سے علماء کے ہاتھ پاؤں چومنے کا جواز نکالا جاتا ہے اس روایت سے کئی باتوں کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

(۱) ارباب صحاح ستہ نے جو شرطیں حدیث کی صحت کے لئے مقرر کی ہیں وہ کس حد تک اسکی ضمانت کرتی ہیں

(۲) ان ائمہ کے حسنٌ صحیحٌ کہنے کی قدر و قیمت کیا ہے۔

(۳) جو لوگ ایسی حدیثوں پر ایمان رکھنے کو دین اور قرآن جیسے آسمانی نور اور جاودانی حق کے [illegible] کو الحاد و بیدینی قرار دیتے ہیں وہ کہاں تک دین کی حقیقت سے آشنا ہیں۔

(۵) رسول کریم نے حدیثوں کی حفاظت کیطرف کوئی توجہ نہ فرمائی بلکہ صحیح مسلم میں ہے کہ آپ نے حکم دے رکھا تھا:۔

لاتکتبوعنی شیئاً غیر القرآن الخ	مجھ سے سوائے قرآن کے کچھ نہ لکھو۔

اگر بعض روایات میں ہے کہ آپ نے فتح مکہ کے دن کا خطبہ ابوشاہ کو لکھوا دیا یا کسی خاص صحابی کو لکھنے کی اجازت دے دی تو یہ مستثنیات میں شمار ہوگا عام حکم یہی تھا کہ سوائے قرآن کے کچھ نہ لکھا جائے اور یہی صحابہ کرام نے سمجھا تھا چنانچہ ابوداؤد کی کتاب العلم میں ہے۔

وفد لزید بن ثابت علی معاویہ فسالہ عن حدیث فامر ان یکتبہ فقال لہٗ زید ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امرنا ان لا نکتب من حدیثہ فمحاہ	حضرت زیدؓ بن ثابت امیر معاویہ کے پاس گئے تھے انھوں نے ایک حدیث دریافت کی پھر ایک آدمی کو حکم دیا کہ اسکو لکھ لے زید نے کہا رسولؐ نے ہمکو حکم دیا ہے کہ ہم انکی حدیث نہ لکھیں اسلئے اسکو مٹا دیا۔

اس سے علماء حدیث کی وہ توجیہ بھی غلط ہوجاتی ہے جو انھوں نے کی ہے کہ ممانعت کتابت حدیث کا [illegible]

اس لئے تھا کہ حدیثیں آیات کے ساتھ مخلوط نہ ہوجائیں۔

بیشک روایات کو بیان کرنے کی اجازت حدیثوں سے نکلتی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ حضور اکرم روایت کو روایت ہی رکھنا چاہتے تھے اور دین یعنی قرآن کی طرح اسکو محفوظ بنانا پسند نہیں کرتے تھے۔

حضرت ابوبکرؓ نے اپنے عہد میں روایت سے بھی منع کردیا جب لوگوں کو دیکھا کہ اس میں اختلاف کرتے ہیں تو جمع کرکے فرمایا کہ آج تم اختلاف کرتے ہو آئندہ لوگ اس سے بھی زیادہ اختلاف کریں گے اسلئے رسولؐ سے کوئی روایت نہ کرو۔[۵۱]

اُنھوں نے خود تقریباً ۵ سو حدیثوں کا ایک مجموعہ لکھا بھی تھا۔ اسکو آگ میں جلادیا۔[۵۲]

حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں اور بھی زیادہ سختی برتی اگر کوئی روایت کرتا تو وہ درہ لیکر اسکو مارنے کو تیار ہوجاتے اور جبتک گواہ اور شاہد نہ لے لیتے نہ چھوڑتے۔ لکھنے کی مطلق اجازت نہ دیتے۔

قال عبد اللہ بن علاء سالت القاسم بن محمد بن ابی بکر ان یملی علی الحدیث۔ فقال ان الاحادیث قد کثرت علی عهد عمر بن الخطاب فانشد الناس ان یاتوہ بها۔ فلما اتوہ بها امر بتحریقها۔ ثم قال مثناة کمثناة اہل الکتاب۔ قال فمنعنی القاسم یومئذ ان اکتب حدیثاً (طبقات ابن سعد جز خامس صفحہ ۱۴۰)

عبداللہ بن علا کہتے ہیں کہ میں نے قاسم بن محمد ابن ابوبکرؓ سے کہا کہ مجھ کو حدیث لکھوائے انھوں نے کہا کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں حدیثیں زیادہ ہوگئی تھیں انھوں نے منادی کرائی کہ لوگ حدیثیں انکے پاس لائیں جب لائے تو حکم دیا کہ انکو جلادو۔ پھر فرمایا کہ سنت جیسے اہل کتاب کی سنت[۵۳] علا کہتے ہیں کہ اس دن سے مجھے قاسم نے روک دیا کہ میں ایک حدیث بھی لکھوں۔

حضرت عثمانؓ کے پاس محمد بن علی ایک نوشتہ لے گئے جسمیں نبی صلعم کا وہ حکم لکھا ہوا تھا جو زکوٰۃ کے بارے میں تھا انھوں نے کہا کہ مجھے اس سے معاف کرو۔[۵۴] حضرت علیؓ سے جب کوئی حدیث بیان کرتا تھا تو اس سے حلف لے لیتے تھے۔[۵۵]

حضرت ابن عباس نے بھی حضرت ابوہریرہ کی حدیث "الوضو مما مسته النار" اور حضرت علی کی حدیث "نهی عن المتعة" اور حضرت ابوسعید خدری کی حدیث قبول کرنے سے انکار کیا۔[۵۶]

رسول صلعم اور صحابہ کرام کے اس طرز عمل سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ حدیث کو دین نہیں سمجھتے تھے ورنہ قرآن کیطرح اسکی حفاظت بھی کرتے۔ بیشک احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خلفاء راشدین نے شہادت لینے کے بعد روائتیں قبول کی ہیں جسکی وجہ یہ تھی کہ انکو عینی گواہ ملجاتے تھے جو شہادت دیتے تھے کہ ہم نے اپنے کانوں سے رسولؐ کی زبان مبارک سے اسکو سنا ہے۔ مگر عہد صحابہ کے بعد عینی شہادت کا ملنا ناممکن ہوگیا اور شہادت در شہادت

---

[۵۱] تذکرۃ الحفاظ امام ذہبی ترجمہ ابوبکر [۵۲] تذکرۃ الحفاظ [۵۳] یہود نے انبیاء کی روایات کتاب میں جمع کی تھیں جسکا انجام

[۵۴] توجیہ النظر صفحہ ۱۶ [۵۵] توجیہ النظر ص ۱۱ [۵۶] توجیہ النظر صفحہ

Marfat.com

عقلاً۔ عرفاً یا قانوناً کسی لحاظ سے قابلِ سماعت نہیں۔ ایسی شہادت کی بنیاد پر آپ کسی عدالت سے ایک پیسہ کا بھی فیصلہ اپنے حق میں نہیں لے سکتے۔

(۶) روایت کی صحت کا معیار ائمہ حدیث نے راویوں کی ثقاہت اور عدالت کو قرار دیا ہے حدیث کے جانچنے کا سب سے بڑا ذریعہ انکے پاس یہی ہے۔ ارباب صحاح ستہ میں سے ہر ایک نے جو شرائط رکھی ہیں ان میں جو فرق مراتب ہے۔ وہ رواۃ کی ثقاہت کا ہی ہے۔ امام بخاری صرف اول درجہ کے ثقہ راویوں کی روایت لیتے ہیں[1]۔ امام مسلم کہیں درجہ دوم والوں کو بھی قبول کر لیتے ہیں۔ ارباب سنن ان سے بھی کچھ نرم ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ اس ثقاہت کو تولنے کی کون سی میزان ہے کیا ہی کہ ثقہ لوگ انکو ثقہ کہیں؟ پھر ان دونوں کی ثقاہت کا سوال آتا ہے حقیقت یہ ہے کہ ثقاہت یا عدالت خود ائمہ حدیث کی تعریف کے مطابق[2] باطنی وصف ہے جسکے اوپر سوائے ظن اور تخمین کے کوئی قطعی شہادت نہیں ہو سکتی لہذا سارا دارومدار حدیث کا شروع سے آخر تک ظن پر ہے۔

رواۃ میں طبقہ اول صحابہ کرام کا ہے۔ ائمہ حدیث نے یہ طے کر دیا ہے کہ جملہ صحابہ ثقہ ہیں۔ علامہ ابن صلاح کہتے ہیں۔

المصحابتہ باسرھم خصیصۃ، وھی ان لا یسال عن عدالۃ احدھم بل ذلک امر مفروغ عنہ (مقدمہ ابن صلاح ص۱۴۹)	جملہ صحابہ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ان میں سے کسی کی عدالت کا سوال نہیں اُٹھایا جا سکتا۔ بلکہ یہ ایسا امر ہے کہ طے شدہ ہے۔

پھر اسی صفحہ میں ہے:۔

ان الامۃ مجمعۃ علی تعدیل جمیع الصحابتہ ومن لابس الفتن منھم کذالک	تمام صحابہ کی تعدیل پر امت کا اجماع ہے ان میں سے جو فتنوں میں شریک ہوئے وہ بھی ایسے ہی ہیں۔

صحابہ کی تعریف بھی انھیں کی زبان سے سُن لیجئے:۔

المعروف من طریقۃ اہل الحدیث ان کل مسلم راٰی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فھو من الصحابتہ	طریقہ اہلحدیث کے مطابق مشہور ہی ہے ہر مسلمان جس نے اللہ کے رسول کو دیکھا وہ صحابی ہے (مقدمہ ابن صلاح ص۱۴۹)

صحابہ کرام کی عظمت و جلالت شان کی وجہ سے ہم اصول مذکورہ پر جو غیر صحیح۔ قرآن کے خلاف اور نص تقید سند کا فیصلہ ہے بحث کرنا پسند نہیں کرتے لیکن اس امر پر اپنی حیرت کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ایک طرف تو یہ فیاضی کہ ہر ایک صحابی کو عدالت اور ثقاہت کا پورا پورا حصہ دیدیا جاتا ہے اور دوسری طرف یہ بخل کہ کسی غیر صحابی میں مومن بھی نہیں صرف مسلم کہا جاتا ہے حالانکہ اس عہد کے منافقین بھی جن کی بابت قرآن میں ہے:۔

---

[1] امام بخاری نے جب اپنی کتاب صحیح لکھنی شروع کی تو ۶ لاکھ حدیثوں میں سے جو انکے یا ان تک پہنچی تھیں جو انھوں نے درج کیں ان میں سے اگر مکررات نکالدی جائیں تو یہ تعداد ۴ ہزار سے بھی کم رہ جاتی ہے (مقدمہ ابن صلاح ص۱۴۹)

[2] عدالت محدثین کے نزدیک وہ ملکہ راسخہ ہے جو فسق، علم، دین اور خلاف مروت سے مانع ہو (توضیح الافکار ص۱۴۹)

Marfat.com

ومن اهل المدینة مردوا علی النفاق لاتعلمهم نحن نعلمهم ۹/۱۰۲	اور کچھ لوگ مدینہ کے نفاق پر اڑے ہوئے ہیں انکو تم نہیں جانتے ہم جانتے ہیں۔

مسلمان ہی کہلاتے تھے اور رسول اللہ تک کو انکے نفاق کا علم نہ تھا۔ نیز واقعۂ "اِفک" میں جو لوگ شریک تھے جن پر حدِ قذف پڑی۔ جن کی نسبت قرآن میں حکم دیا گیا ہے:۔

لاتقبلوا لهم شهادةً ابدا ۲۴/۵	نہ قبول کرو ان کی کوئی گواہی کبھی۔

وہ بھی مسلمان ہی کہے جاتے تھے علاوہ بریں ایک طرف تو یہ روایت کی جاتی ہے کہ رسول اللہ نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں فرمایا تھا۔

لاترجعوا بعدی کفاراً یضرب بعضکم رقاب بعض	میرے بعد پلٹ کر کافر نہ بنجانا کہ ایکدوسرے کی گردن مارنے لگو۔

دوسری طرف جن لوگوں نے فتنوں میں پڑکر باہمی لڑائیوں میں ایکدوسرے کا گلا کاٹا انکو بھی ابوبکر و عمر کے ساتھ ثقاہت کے پلّہ میں ہموزن رکھدیا جاتا ہے۔

صحابہ کے بعد ہر ہر طبقہ کے رواۃ ایک ایک کرکے جرح و تعدیل کے مسلخ میں لائے جاتے ہیں اور انکی پوست کشی کی جاتی ہے بہت سے کذّاب۔ خبیث اور دجال وغیرہ قرار دئے جاتے ہیں اور بہتوں پر مہر توثیق ثبت ہوتی ہے پھر ان ثقاۃ میں سے بھی کمتر ایسے ہیں جو جرح کی تیغ سے زخمی نہ ہوں ایک کو ایک اگر صادق کہتا ہے تو دوسرا اُسی کو کاذب بناتا ہے[۱]۔ اور یہ سب کچھ محض ظن، زی تخمین۔ اللہ نے فرمایا ہے۔

قتل الخراصون ۵۱/۱۰	اٹکل دوڑانے والے مارے پڑے۔

آپ کہیں گے کہ تشکک کی دوا لقمان کے پاس بھی نہیں مگر منکرین کو تشکک کی بیماری نہیں ہے اُنکا کہنا تو یہ ہے کہ یہ دین کا راستہ ہی نہیں ہے جو آپ نے اختیار کیا۔ دین کو براہ راست اللہ نبیؐ پر نازل کردیتا ہے اس علیم و حکیم نے اپنے بندوں کو اس بات کا محتاج نہیں چھوڑا ہے کہ عقل اور انسانیت کے خلاف پہلے وہ لاکھوں مردہ رگوں کو جرح و تعدیل کی بھٹی میں جلا کر کھرا کھوٹا الگ کریں[۲] پھر دین کا پتہ لگائیں اس نے صاف صاف اعلان کردیا ہے:۔

---

[۱] کوئی خوش قسمتی سے اگر بالکل بیداغ نکل گیا تو تدلیس کے بے پناہ تیروں سے بچنا مشکل تھا بڑے بڑے ائمہ مثلاً حسن بصری، مکحول شامی۔ سفیان ثوری۔ مالک بن انس اور دارقطنی وغیرہ اس کا نشانہ بنے ہوئے ہیں حافظ ابن مندہ نے تو امام بخاری و مسلم پر بھی وار کیا تھا مگر علماء حدیث نے بیچ میں پڑکر روک لیا (طبقات المدلسین ابن حجر)

[۲] مذہبی جماعتوں میں ہم خیالی بڑی چیز ہے تعدیل میں زیادہ کارفرما یہی جذبہ تھا ذرا بھی کوئی اختلاف نکلا کہ مجروح ہوا۔ تعدیل کا منظر بھی ایک مضمون میں بسط کے ساتھ دکھانے کے قابل ہے۔

Marfat.com

یا ایھا الناس قد جاءکم من اللہ نور وکتاب مبین یھدی بہ اللہ من اتبع رضوانہ سبل السلام ویخرجھم من الظلمات الی النور باذنہ ویھدیھم الی صراط مستقیم ۵/۱۹	لوگو! اللہ کیطرف سے تمھارے پاس روشنی اور کتاب مبین آچکی۔ جو لوگ اللہ کی رضا کے پیرو ہیں انکو اللہ اسکے ذریعہ سے سلامتی کی راہ دکھاتا ہے اور اپنے حکم سے انکو تاریکی سے روشنی میں نکالتا ہے۔ اور سیدھی راہ دکھاتا ہے۔

(۷) قرآن اتحاد پیدا کرتا ہے۔ اسکا پیغام ایک، اسکی راہِ عمل ایک اور اسکی منزل مقصود ایک ہے وہ کوئی فرقہ بنانے نہیں آیا ہے بلکہ اقوام عالم میں حق کو ذریعۂ وحدت بنانا چاہتا ہے اس نے جملہ انبیاء و رسل کی امتوں کو ایک ہی امت قرار دیا ہے۔

ان ھذہ امتکم امۃ واحدۃ وانا ربکم فاعبدون ۲۳/۵۴	یہ تم سب کی امت حقیقت میں ایک ہی امت ہے، اور میں تمھارا رب ہوں مجھی کو پوجو۔

فرقہ بندی کو وہ کفر و ضلالت بلکہ شرک قرار دیتا ہے:۔

ان الذین فرقوا دینھم وکانوا شیعا لست منھم فی شی ۶/۱۶۱	جن لوگوں نے اپنے دین کو جدا کر لیا اور گروہ گروہ ہو گئے ان سے (اے محمدؐ) تجھ کو کوئی واسطہ نہیں۔
ولا تکونوا کالذین تفرقوا واختلفوا من بعد ما جاءھم البینات واولئک لھم عذاب عظیم ۳/۱۰۲	ان لوگوں کی طرح نہ بنو جنھوں نے نشانیوں کے آجانے کے بعد تفرقہ ڈالا وہ لوگ تو وہ ہیں جنکے لئے بڑا عذاب ہے۔
ولا تکونوا من المشرکین من الذین فرقوا دینھم وکانوا شیعا کل حزب بما لدیھم فرحون ۳۰/۳۲	تم مشرک نہ بنو یعنی وہ جنھوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈالا اور گروہ گروہ ہو گئے اور ہر جماعت اسی میں مگن ہے جو اسکے پاس ہے

یہ حق ہے کہ مسلمانوں میں جو جو فرقے پیدا ہوئے انکی بنیادیں خاص خاص روایتوں ہی پر تھیں اور اب تک ہیں جملہ مذاہب اسلامی کی بنیادی سندیں جو روایات ہیں گنائی جا سکتی ہیں بلکہ ان میں سے اکثر فرقہائے اسلامی کے مورخین نے اپنی اپنی کتابوں میں گنائی بھی ہیں علامہ ابن جوزی کے بیان کے مطابق بہت سے فرقوں نے حدیثیں بنا بنا کر اپنے اصول مضبوط کئے ہیں اسلئے روایات تفریق و تشتت کا موجب ہوئیں جن سے امت کی وحدت پارہ پارہ ہو گئی اگر قرآن پر جملہ اختلافات کا فیصلہ رکھا جاتا تو یقیناً کوئی تفریق نہیں ہو سکتی تھی ہر چند کہ انسانوں میں اختلاف ہمیشہ رہا

لا یزالون مختلفین الا من رحم ربک ۱۱/۱۱۹	ہمیشہ اختلاف کرتے رہیں گے مگر وہ جن پر تیرا رب مہربان ہے۔

مگر ہمارا مقصد جملہ بنی نوع انسان سے نہیں بلکہ "من رحم ربک" یعنی اہلِ حق اور مسلمانوں سے ہے کہ ان میں وحدت قائم رہتی۔

Marfat.com

کہا جاسکتا ہے کہ حدیثوں کے دین نہ ماننے پر بھی فہم قرآن میں اختلاف ممکن ہیں اسلئے پھر بھی فرقے پیدا ہوسکتے ہیں۔ بیشک فہم معانی میں اختلاف ہونگے لیکن ان کے اوپر فرقہ کی تعمیر نہ ہوسکے گی کیونکہ قرآن کی حقیقت ایک۔ تعلیم ایک۔ مفہوم ایک اور غرض اور منتہائے نظر ایک ہے۔ جو شخص کسی مسئلہ میں کوئی رائے قائم کریگا علمار قرآن کے مسلسل غور و فکر کے بعد اگر وہ صحیح ثابت ہوگی تو تسلیم کرلیجائیگی ورنہ مسترد۔ بجنسہٖ اسیطرح جس طرح اس عالم مادّی میں علمار طبیعی وغیرہ الگ الگ نظریے قائم کرتے ہیں پھر ایک مدت تک غور و فکر کرتے کرتے اُن پر اسکی صحت یا غلطی نمایاں ہوجاتی ہے قرآن میں کامل صلاحیت اس بات کی موجود ہے کہ جملہ اختلافات کا قطعی فیصلہ کرسکے۔ وہ کتاب "مفصّل" اور تبیاناً لکلِ شیٍٔ ہے۔

یہ تو علمی پہلو ہے اور عملی پہلو سے تو قرآنی جمہوریت اسقدر وسیع اور روشن ہے کہ اسمیں بجائے وحدت کے تفریق ہو ہی نہیں سکتی اسلام کا ابتدائی عہد یعنی قرون اول جس میں نہ حدیثیں مدون ہوئی تھیں نہ انھوں نے دینی حیثیت حاصل کی تھی خالص عمل بالقرآن کا دور تھا جس نے ہر لحاظ سے اسکو خیر القرون بنا دیا تھا۔ تفرقے اسی وقت سے پیدا ہوئے جب سے روایت اور شخصیت پرستی آئی۔

کہا جاتا ہے کہ حدیثوں کو تمام امت نے شرق سے غرب تک دینی حجت تسلیم کرلیا پھر اسمیں تمھارے لئے بحث کی گنجائش کہاں رہی، جواب یہ ہے کہ تمھارے نزدیک چار دلیلیں ہیں۔ کتاب، سنت، اجماع اور قیاس اور اسی ترتیب سے انکے مدارج ہیں کیا تم حدیث کو جو بلند تر حجت ہے اجماع سے جو فروتر حجت ہے ثابت کرنا چاہتے ہو یعنی اپنے مشعل کو چراغ کی روشنی سے دکھانا چاہتے ہو۔ اگر ایسا ہے تو تمھارا مشعل تاریک ہے۔ اجماع سارے عالم کے نزدیک صرف ایک ہنگامی چیز ہے یہ مسلمانوں کی خصوصیت ہے کہ انھوں نے اسکو دینی حجت اور دائمی حق بنا رکھا ہے۔

ان دلائل کے علاوہ منکرینِ حدیث نے اُن مضر اثرات اور نتائج پر بھی بسط کیساتھ بحثیں کی ہیں جو روایت پرستی سے پیدا ہوئے ہیں اور اس سے بھی زیادہ تفصیل کے ساتھ انھوں نے حدیثوں کی بے اعتباری ثابت کرانے کی کوشش کی ہے مگر میں نے اس مضمون میں اُن باتوں کو قصداً چھوڑ دیا کیونکہ موضوع بحث یہ نہیں حدیثوں کے دینی حجت ہونے یا نہ ہونے سے انکو زیادہ تعلق نہیں۔

Marfat.com

حکمِ وصیّت و قانون وراثت

(حضرت مولانا تمنّا عمادی مجیبی پھلواری شریف)

قرآن مبین نے ہر مسلمان پر فرض کیا ہے کہ جب وہ مرنے لگے تو اپنے مال متروکہ کے بارے میں اپنے والدین اور قریب تر رشتہ مندوں کے لئے مناسب وصیت کر جائے آیت یہ ہے :-

کتب علیکم اذا حضر احدکم الموت ان ترک خیراً ن الوصیۃ للوالدین والاقربین بالمعروف حقاً علی المتقین ٥ فمن بدلہ بعد ما سمعہ فانما اثمہ علی الذین یبدلونہ ط ان اللہ سمیع علیم ٥ فمن خاف من موص جنفاً او اثماً فاصلح بینھم فلا اثم علیہ ط ان اللہ غفور رحیم ٥

(بقرہ ع ۲۲ پ ۲)

(اے مسلمانو) تم پر فرض کیا گیا۔ کہ جب تم میں سے کسی کو موت کا وقت آجائے اور وہ کچھ مال چھوڑنے والا ہو تو اپنے باپ، ماں اور قریب تر رشتہ مندوں کے لئے وصیت کر جائے۔ مناسب وصیت۔ یہ متقی لوگوں پر (اللہ تعالیٰ کا قائم کردہ) ایک حق ہے۔ (ان کے پس ماندوں کا) تو جو شخص اس وصیت کو سن لینے کے بعد بدل دے تو اس کا گناہ اس بدلنے والے پر ہوگا بیشک اللہ جاننے والا اور سننے والا ہے۔ ہاں جو شخص وصیت کرنے والے سے ڈرا (اس کی) بے انصافی یا گناہ کی (وصیت کی) وجہ سے تو اس نے ان پسماندوں کے درمیان صلح کرادی تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے اور اللہ بخش دینے والا مہربان ہے۔

چونکہ اس قسم کے معاملات میں گواہی کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ اس لئے حکم ہوا کہ وصیت کے وقت گواہ بھی ضرور رکھ لو۔ چنانچہ ارشاد ہوا :-

یاایھا الذین امنوا شھادۃ بینکم اذا حضر احدکم الموت حین الوصیۃ اثنان ذوا عدل منکم او آخران من غیرکم ان انتم ضربتم فی الارض فاصابتکم مصیبۃ الموت تحبسونھما من بعد الصلوٰۃ فیقسمن باللہ ان ارتبتم لا نشتری بہ ثمناً ولو کان ذا قربیٰ ولا نکتم شھادۃ اللہ انا اذاً لمن الاثمین ٥

اے ایمان والو! جب تمہاری موت کا وقت آجائے اور تم وصیت کرنے لگو تو تمہارے درمیان گواہی کا اصول یہ ہے کہ تم میں سے دو انصاف والے گواہ ہوں۔ اور اگر تم سفر میں ہو اور سفر میں ہی موت کا وقت آگیا (اور اپنی جماعت کے دو گواہ نہ ملیں تو غیر جماعت کے دو انصاف والے گواہ ہوں۔ ان دونوں گواہوں کو نماز کے بعد تک مسجد میں روکے رکھو۔ پھر اگر تم لوگوں کو (اس وصیت کے متعلق) کچھ شک ہو تو وہ

Marfat.com

فان عثر علىٰ انهما استحقا اثماً
فاٰخران يقومٰن مقامهما من الذين
استحق[1] عليهم الاوّلين فيقسمٰن
بالله لشهادتنا احق من شهادتهما
وما اعتدينا انا اذاً لمن الظّٰلمين ٥
ذالك ادنىٰ ان يأتوا بالشّهادة
علىٰ وجهها او يخافوا ان تردّ ايمانٌ
بعد ايمانهم فاتّقوا الله واسمعوا
والله لا يهدى القوم الفٰسقين ٥
(مائدہ ۱۴/۴ ث)

دونوں اللہ کی قسم کھائیں۔ کہ ہم اپنے اس حلفیہ بیان پر کوئی قیمت (دنیاوی) نہیں حاصل کرتے۔ اگرچہ وہ (جس کے حق میں وصیت ہے) قرابت مند ہی ہمارا ہو اور ہم اللہ کی گواہی کو چھپاتے نہیں۔ (اگر ہم ایسا کر رہے ہیں) تو اس وقت بے شک ہم ظالموں میں سے ہیں۔ پھر اس کا اگر پتہ لگ گیا کہ ان دونوں گواہوں نے (اپنی گواہی کے ذریعے) حق مارا ہے گناہ کرکے، تو دو دوسرے گواہ ان دونوں کی جگہ کھڑے ہو جائیں ان لوگوں میں سے جن کا حق مارا ہے ان دونوں نے جو اولیٰ تھے (شہادت میں) تو اب یہ دوسرے قسم کھائیں اللہ تعالیٰ کی کہ ہماری گواہی ان دونوں کی گواہی سے زیادہ حق ہے اور ہم نے حدِ صداقت سے تجاوز نہیں کیا ہے۔ اگر ایسا کیا ہو تو ہم لوگ اس وقت ظالموں میں سے ہیں (حاشیہ دیکھئے) اس میں امید ہے کہ ادا کریں شہادت وہ (جو اولےٰ ہیں شہادت کے لئے) ٹھیک اس طرح پر یا وہ ڈریں کہ (ان کی) قسم ردّ نہ کر دیجائے ان (وارثوں یا دوسرے گواہوں) کی قسم کے بعد تو ڈرو اللہ سے اور (اس کے احکام گوشِ دل سے) سنو۔ اور اللہ بدکاروں کی ہدایت نہیں کرتا۔

قرآن مبین میں ناسخ و منسوخ کی بحث فرقہ بند علماء کی یادگار ہے۔ حدیثیں تو ہر فرقے نے اپنے اپنے موافق خود بھی گڑھ لیں اور دوسروں کی گڑھی حدیثیں بھی جمع کر لیں اور اپنے خلاف جو حدیثیں پائیں ان پر کچھ جرحیں کرکے ان کو موضوع یا ضعیف کہہ دیا، یا ان کی کوئی تاویل پیش کر دی۔ مگر آیات قرآنیہ کو کیا کرتے ہو؟ تو اگر اختلافات قرارت سے کام چلا تو متواتر توراث قرارت کے خلاف کسی صحابی یا تابعی کی طرف منسوب کوئی قرارت پیش کرکے اپنا کام نکالا۔ اور کبھی ناسخ و منسوخ کی بحث چھیڑ کر۔ مگر اس وقت میرا یہ موضوع بحث نہیں ہے اس لئے میں اس بحث سے قطع

---

[1] تحاقّ، احقاق، باہم حق کے لئے لڑنا۔ کہ ہر فریق اپنے کو حق پر کہے یا اپنا حق بتلائے۔ استحقاق حق مارنا، حق دبا لینا۔ جب "علیٰ" کے صلے کے ساتھ آئے اور متعدی ہو تو اس معنی میں آتا ہے۔ الاولیان استحق کا فاعل ہے جو لوگ آخر آن کی صفت اسکو قرار دیتے ہیں وہ نحوی قواعد کو نظر انداز کر جاتے ہیں، نکرہ کی صفت معرفہ لانا۔ پھر ق کا فاعل ڈھونڈھتے پھرنا اور جب نہ ملے تو اثم کو اس کا فاعل بنانا کیسے پر رکاکت کا اثر کا ب ہے۔ اختلاف قرارت والوں کو تو نہ پوچھئے ان کا ذکر ہی بیکار ہے اصل یہ ہے کہ جنکو میت نے مرنے کے وقت اپنی گواہ بنایا وہی گواہی کے لئے اولیٰ سمجھے جا سکتے ہیں انکو اپنی قسم کا وقار خود رکھنا چاہئے۔ میت نے انھیں کو شہادت کیلئے منتخب کیا وہی اسلئے ان پر اعتماد کیا تو وہی اولیٰ بالشہادۃ ہیں مگر ان کے خلاف وارثوں کے پاس اگر دلائل ہیں تو یہ کیوں ایسی قسمیں کھائیں جو انکو قسم دار سے رد کر دی جائے۔

نظر کرتے ہوئے لکھتا ہوں کہ آیات وراثت سورۂ نساء میں ہیں اور یہ سورہ جب کہ کہا جاتا ہے کہ سورۂ بقر کے بعد نازل ہوا ہے مگر سورہ مائدہ تو بالکل آخری سورتوں میں ہے۔ سورہ مائدہ کے بعد تو صرف سورۂ توبہ اور اس کے بعد آخری سورہ نصر نازل ہوا ہے۔ اس لئے سورۂ نساء سے تو سورۂ مائدہ کو منسوخ نہیں کیا جا سکتا۔ اور نہ کسی روایت میں ہے کہ سورہ مائدہ کی یہ آیت جو شہادت وصیت کے متعلق آئی ہے اس کا نزول سورہ نساء کی آیت وراثت کے بعد ہوا۔

اس کے علاوہ ناسخ و منسوخ کا اصول تو یہ ہے کہ دونوں کا اجتماع محال ہو۔ اسلئے مجبوراً ایک کو ناسخ دوسرے کو منسوخ قرار دیتے ہیں، مگر یہاں آیتِ حکم وصیت اور آیتِ قانون وراثت میں کسی طرح کا تضاد نہیں کہ دونوں کے احکام پر عمل عقلاً محال ہو۔

اوّل تو آیت وصیت کی رو سے وصیت کا حکم مرنے والے کو ہے اور تقسیم وراثت کو کم ورثہ یا حاکم شرع کو، دو حکم دو شخصوں کو الگ الگ ہوں تو کوئی وجہ نہیں کہ ایک حکم کی وجہ سے دوسرا حکم منسوخ ہو جائے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ آیت وراثت میں جسکا حصہ بھی بیان کیا ہے۔ من بعد وصیۃ کی قید کے ساتھ بیان کیا ہے۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ آیات قانون وراثت وصیت کے حکم کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کا لحاظ رکھتے ہوئے نازل کی گئی ہے۔ تو جو حکم پہلے حکم کو باقی رکھ رہا ہے، فقہا کس طرح اس حکم کو اس پہلے حکم کا منسوخ کرنے والا قرار دیتے ہیں۔ یہ ایک عجیب بات ہے۔

لے دیکر سب سے بڑا سہارا ان لوگوں کی ایک حدیث ہے لا وصیۃ لوارثٍ اور چونکہ ان کی یہ عادت ہے کہ آیات قرآنی سے زیادہ حدیثوں کو اہمیت دیں۔ اس لئے کتنوں نے تو صرف اسی حدیث سے حکم دینے والی آیت کو منسوخ کہہ دیا۔ جو ذرا اس میں ہچکچائے تو انھوں نے آیات وراثت سے آیت وصیت کو منسوخ کہہ کر گویا اسی اعتراض سے اپنا بچاؤ کر لیا کہ یہ قرآن کو روایت کے ذریعے منسوخ کر رہے ہیں۔

اگر یہ حدیث نہ ہوتی؟

اگر یہ حدیث لا وصیۃ لوارثٍ کی ان فقہاء و محدثین کے پاس نہ ہوتی تو کیا یہ لوگ آیت حکم وصیت کو قانون وراثت کی آیتوں سے باوجود ہر حقے کی تصریح کے بعد "من بعد وصیۃٍ" کی قید موجود ہونے کے منسوخ سمجھ سکتے تھے؟ حاشا و کلا، کبھی نہیں۔

کیا یہ حدیث واقعی متواتر ہے؟

متواتر کی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ صحابہ و تابعین و اتباع تابعین کے تینوں دوروں میں جس حدیث کے راوی اتنے زیادہ ہوں کہ یہ گمان نہ کیا جاوے کہ اتنی بڑی جماعت نے ایک جھوٹی حدیث کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کرنے پر اتفاق کر لیا ہوگا۔

یہ تعریف ہر چند منافقین عجم جو تابعین و اتباع تابعین ہی کے زمرے میں تھے انکی دروغ بافیوں کو

ان کی ایک باضابطہ مکمل سازش سے بے خبر اگر اپنے کو رکھا جائے تو ضرور نہایت صحیح اور مناسب معلوم ہوگی۔ ورنہ اگر ان عجمی تابعین واتباع تابعین کے سامنے یہ تعریف متواتر حدیث کی بیان کی جاتی تو وہ اگرچہ زبان سے تو کچھ کہتے مگر اس کی تصحیح و تصدیق بڑے زوروں پر کرتے، مگر دل ہی دل میں یہ ضرور کہتے کہ تم کیا کہتے ہو کہ اتنی بڑی جماعت کا ایک جھوٹی حدیث کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کرنے پر متفق ہونا عقلاً محال ہے حالانکہ بارہا کردیم و شد۔

طرق روایت پر بحث

بہرحال اب اس حدیث کے طُرق روایت پر نگاہ ڈالئے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ حدیث امام مالک کے موطا اور صحیح مسلم میں بالکل نہیں۔ صحیح بخاری نے باب تو ضرور باندھا ہے باب لاوصیۃ لوارث۔ مگر اسی باب کے تحت میں اس مضمون کی ایک حدیث بھی انکو نہ مل سکی۔ البتہ حضرت عبداللہ بن عباس کی ایک ذاتی رائے انھوں نے نقل کی ہے جس میں لاوصیۃ لوارث کا لفظ بھی نہیں نہ پوری طرح یہ مفہوم اس سے نکل سکتا ہے۔ عنقریب آپ اسکی تصریح ملاحظہ فرمائیں گے۔

غرض اسی حدیث سے مُوطا، بخاری و مسلم تینوں قدیم اور معتبر کتابیں جو علمائے حدیث میں تمام دوسری کتب حدیث سے زیادہ معتبر ہیں بالکل خالی ہیں۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ ان لوگوں کے زمانۂ جمع و تدوین احادیث تک یہ حدیث گڑھی ہی نہیں گئی تھی۔ یا کم سے کم اس وقت تک ایسے راویوں کی زبانوں تک نہیں پہنچی تھی جن کو یہ امام مالک و امام بخاری و امام مسلم سند و حجت سمجھتے تھے۔

سنن ابوداؤد

میں دو باب اس سلسلے میں ہیں۔ پہلا باب فی نسخ الوصیۃ للوالدین والاقربین یعنی والدین اور اقربین کے لئے وصیت کے حکم کا منسوخ ہونا۔ اس باب میں کوئی حدیث رسول نہیں بلکہ حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے۔ وھوا ھذا۔

حدثنا احمد بن محمد المروذی حدثنی علی بن حسین بن واقد عن ابیہ عن یزید النحوی عن عکرمۃ عن ابن عباس رض ان ترک خیرا ان الوصیۃ للوالدین والاقربین۔ فکانت الوصیۃ کذالک حتی نسختھا آیۃ المیراث	ابوداؤد سے احمد بن محمد المروزی نے، اُن سے علی حسین بن واقد نے، ان سے ان کے باپ نے، ان سے یزید نحوی نے ان سے عکرمہ بربری نے ان سے حضرت عباس رض نے فرمایا کہ ان ترک خیرا الوصیۃ للوالدین والاقربین (یہ آیت پڑھ کر کہا) کہ تھی وصیت

طرح یہاں تک کہ اس آیت کو آیت میراث نے منسوخ کردیا۔

بخاری کی روایت

بخاری کی روایت کا ذکر اوپر آچکا ہے، وہ بھی حضرت ابن عباس رض ہی کی ہے اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ اس جگہ اس پر بھی بحث کردی جائے

باب لاوصیۃ لوارث۔ حدثنا محمد بن یوسف عن ورقاء عن ابن ابی نجیح عن عطاء عن ابن عباسؓ قال کان المال للولد وکانت الوصیۃ للوالدین فنسخ اللہ من ذالک ما احب فجعل للذکر مثل حظ الانثیین فجعل للابوین لکل واحد منھما وجعل للمرأۃ الثمن والربع وللزوج الشطر والربع۔

یہ باب ہے اس بارے میں کہ وارث کے لئے وصیت نہیں۔ امام بخاری سے محمد بن یوسف نے ان سے ورقاء نے ان سے ابن ابی نجیح نے ان سے عطا نے ان سے حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ مال پہلے بیٹے کے لئے تھا اور وصیت والدین کے لئے تو اللہ تعالیٰ نے اس میں سے جو مناسب سمجھا اسکو منسوخ کیا تو اولاد میں سے مرد کے لئے دو عورت کا حصہ رکھا اور باقی میں سے ہر ایک کے لئے چھٹا حصہ اور بیوی کے لئے آٹھواں اور چوتھائی اور شوہر کے لئے نصف اور چوتھائی۔

تنقید حدیث کا ایک نہایت اہم طریقہ

جو حدیث درایت قرآنیہ کے خلاف معلوم ہو رہی ہو، مگر متعدد طرق سے اسکی روایت اسطرح نظر آتی ہو کہ اس پر متواتر یا بہت زیادہ مشہور ہونے کا گمان کیا جاسکے اور اس کے کثرت طرق کو دیکھ کر اس حدیث کو باطل و موضوع کہنے کی ہمت نہ پڑتی ہو، تو اس حدیث کے تمام طرق کو اور اس کے راویوں کو پوری تحقیق کے ساتھ دیانت و بازپرس آخرت کو ملحوظ رکھتے ہوئے دیکھنا چاہئے کہ اس کے راوی کون کون ہیں اور کہاں کہاں کے رہنے والے ہیں۔

حضرت امیرالمومنین اعظم صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد جب عہد فاروقیؓ میں ایران فتح ہوا تو اسی وقت سے منافقین ایران نے خراسان کو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جد و جہد جاری رکھنے کے لئے مرکز بنا لیا حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد عہد عثمانی میں دوسرا مرکز ان منافقین عجم کا کوفہ بنا۔ یہی دو اصل مرکز منافقین عجم کے رہے، مگر ان کے علاوہ بصرہ، قرسط، مصر، نصیبین، موصل اور عراق کے پاس چھوٹے چھوٹے گاؤں یمن اور شام کے اکثر شہر مثلاً حمص، دمشق، قیساریہ، فلسطین، انطاکیہ، بصیصہ، طرطوس اور قنسرین وغیرہ میں بھی چھوٹے چھوٹے مراکز ان کے رہے لیکن حدیثوں کے گڑھنے کی اصل ٹکسال خراسان اور کوفہ ہی رہے۔ وقتی طور سے ان چھوٹے چھوٹے مراکز میں بھی ٹکسال قائم کر لی جاتی تھی۔ مگر چونکہ اس فن کے ماہرین زیادہ تر خراسان اور کوفہ ہی میں مجتمع تھے۔ اس لئے حدیثیں عموماً انہیں دونوں جگہوں میں سے کسی جگہ گڑھی جاتی تھیں اور دوسرے مراکز سے ان کی اشاعت کا انتظام کیا جاتا تھا۔ کچھ دنوں تک خراسان کی طرح نیشاپور بھی ان وضاعین کذابین کا مرکز رہا ہے۔ مگر آخر میں سب سے بڑا مرکز اور سب سے بڑی ٹکسال کوفہ ہی بن گیا۔ اسی لئے

Marfat.com

جتنے وضاعین وکذابین کوفے میں ہوئے اور کہیں نہیں ہوئے اور شام کا پورا علاقہ ان منافقین کی زبردست اشاعت گاہ رہا تو ایسی حدیثوں کے رُوات آپ کو یقیناً انہی جگھوں کے رہنے والے یا یہاں سے تعلق رکھنے والے ہی ملیں گے، اور آپ کو تھوڑی چھان بین سے پتہ مل جائے گا کہ یہ تمام طرق انہی جگھوں میں سے کسی ایک یا دو تین جگھوں سے پھیلے ہیں۔

حضرت ابن عباس کا قول

وہ قول جس کو امام بخاری کی کتاب میں دیکھتے ہیں گڑھا تو گیا خراسان میں مگر اس کے گڑھنے والے اپنے فن کے ماہر نہ تھے اسلئے اس میں بعض رکاکتیں رہ گئیں۔ جن کو بعد والوں نے محسوس کیا تو پھر ایک نئی روایت گڑھ ڈالی اور وہ بھی خراسان میں ہی گڑھی گئی جسکو سنن ابی داؤد میں آپ دیکھتے ہیں اس میں وہ رکاکتیں نکال دی گئیں۔ بخاری کی روایت میں جو رکاکتیں ہیں ان کو بھی عنقریب بتا دوں گا۔ جب متن حدیث پر بحث ہوگی۔ ابوداؤد کی روایت تو اوّل سے آخر تک مروزیوں یعنی "مرو"[1] کے رہنے والوں سے چلی ہے۔ احمد بن محمد المروزی دو ہیں۔ احمد بن محمد بن ابراہیم المروزی متوفی ۲۸۳ھ اور احمد بن محمد بن موسیٰ المروزی متوفی ۲۳۵ھ مگر کسی کے تذکرے میں یہ مذکور نہیں کہ ان سے ابوداؤد صاحب سنن نے بھی روایت کی ہے اور نہ دو میں سے کسی کے ذکر میں یہ مذکور ہے کہ یہ علی بن حسین بن واقد المروزی سے روایت کرتے ہیں اسلئے معلوم نہیں کہ یہ کون احمد بن محمد المروزی ہیں۔ بہرحال ہیں وہ مروزی ہی جو بھی ہوں۔

علی بن حسین واقد المروزی کو تو کتب رجال والے ضعیف الحدیث خود تسلیم کر رہے ہیں اور مرجیہ بھی لکھتے ہیں۔ تہذیب التہذیب میں ابن حجر نے اور میزان الاعتدال میں امام ذہبی نے دونوں ہی نے لکھا ہے کہ امام ابوحاتم نے ان کو ضعیف الحدیث کہا ہے اور امام اسحٰق بن راہویہ ان کے بارے میں نہایت بُرا خیال رکھتے تھے اور ابن حبان نے امام بخاری سے نقل کیا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہم رات دن انکے سامنے رہتے تھے مگر ایک حرف بھی ان سے نہیں لکھا۔ یعنی امام بخاری ان کو اس قابل نہیں سمجھتے تھے کہ انکی حدیث لکھی جائے یہ ۱۲۵ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۱۱ھ میں دنیا سے رخصت ہوئے۔" اور ان کے والد بزرگوار حسین بن واقد المروزی متوفی ۱۵۹ھ (بقول صحیح) کی حدیثوں سے امام احمد بن حنبل نہایت سختی کے ساتھ انکار فرماتے ہیں اور یہ ابی سعید الخوری بھی مروزی ہی تھے۔ قریش خاندان کے آزاد کردہ غلام تھے۔ ۱۳۱ھ میں ابومسلم خراسانی نے انھیں قتل کرا دیا تھا۔

---

[1] "مرو" خراسان کا ایک مشہور شہر تھا جہاں وضاعین وکذابین کا ایک جمگھٹا رہتا تھا۔

Marfat.com

غرض ابوداؤد[1] کی اس روایت کا سلسلہ صرف خراسانیوں سے چلا ہے "مرو" خراسان ہی کا ایک مشہور قصبہ تھا۔

امام بخاری کی روایت

اب بخاری کی روایت پر نظر ڈالئے۔ امام بخاری حضرت ابن عباس کا قول روایت کرتے ہیں محمد بن یوسف بن واقدی عثمان النصبی سے۔ یہ بھی ایک غلام آزاد کردہ ہی تھے "فاریاب" جو بلاد ترک میں سے ایک شہر تھا۔ دراصل وہیں کے رہنے والے تھے۔ مگر قیساریہ جو ساحل بحر شام پر آباد تھا وہیں رہتے تھے۔ لیکن ایک مدت تک کوفہ میں بھی رہے اور سفیان ثوری وغیرہ کی خدمت میں حاضر باش رہے۔ سفیان ثوری سے ایسی ایسی روایتیں کرتے تھے، جو ان کے سوا کوئی دوسرا روایت نہیں کرتا تھا۔ اس لئے لوگ ان کی روایتوں کے متعلق ذرا مشتبہ سے رہتے تھے۔ امام یحییٰ بن معین نے انکی بعض حدیثوں کو باطل بھی کہا ہے سنہ ۱۳۰ھ میں پیدا ہوئے اور سنہ ۲۱۳ھ میں وفات پائی۔ مگر چونکہ امام بخاری نے ان سے ۲۶ حدیثیں روایت کی ہیں اس لئے ائمہ رجال نے ان کی توثیق کی ہے۔

ورقار بن عمر بن کلیب الیشکری۔ یہ کوفی تھے۔ امام احمد بن حنبل نے فرمایا کہ یہ خراسان کے ہیں یعنی خراسانی ہیں مگر کوفہ میں آکر رہ گئے تفسیر میں مشہور تھے۔ مگر امام احمد نے فرمایا کہ یہ تفسیر میں تصحیف بہت کیا کرتے تھے۔ معاذ بن معاذ نے یحییٰ القطان سے پوچھا کہ تم نے منصور کی حیثیت سنی ہے؟ انھوں نے کہا کہ ہاں۔ پوچھا کہ کس سے؟ کہا کہ ورقا سے۔ انھوں نے کہا کہ وہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ وکیع تفسیر بیان کرنے لگے تو ابراہیم الحربی نے لوگوں سے کہا کہ انکی تفسیر سنو۔ ان کی تفسیر میں کلبی اور ورقا کی تفسیری روایتیں نہیں ہوتیں۔ کلبی مشہور کذاب و مفتری تھا۔ اسکے برابر ورقا کا ذکر بالکل اسی نوعیت میں بتا رہا ہے کہ دونوں ہی تفسیری روایتوں کے راوی ہیں اور ایک ہی معیار کے ہیں۔ دونوں کذاب ہیں۔

ورقار کی ولادت یا وفات کا سال ابن حجر وغیرہ نہیں لکھتے۔ مگر یہ لکھا ہے کہ ابوالمنذر اسمٰعیل بن عمر انکی وفات کے وقت آئے تھے اور ابوالمنذر کی وفات سنہ ۲۰۰ھ کے بعد ان کے ترجمے میں لکھی ہے۔ اسلئے ورقا کی وفات سنہ ۲۰۰ھ میں یا اس کچھ پہلے ہوئی ہوگی۔

---

[1] امام ابوداؤد جن کی کتاب سنن ابی داؤد مشہور ہے اور صحاح ستہ میں شمار کی جاتی ہے۔ ان کا پورا نام سلیمان بن الاشعث ہے۔ سنہ ۲۰۲ھ میں انکی ولادت ہے اور سنہ ۲۷۵ھ میں وفات۔ ان کے ترجمے میں ان کے شیوخ کے نام بھی ائمہ رجال نے لکھے ہیں مگر کوئی بھی انکے شیوخ میں احمد بن محمد المروزی کا نام نہیں لکھتا ہے۔ عجب کیا ہے کہ یہ حدیث ایک سلسلہ اسناد قائم کرکے انکی کتاب میں داخل کردی گئی ہے۔ ورنہ کیا معنی کہ احمد بن محمد المروزی کا نام نہ ابوداؤد کے شیوخ میں مذکور ہے نہ علی بن حسین بن واقد کے تلامذہ میں اور نہ احمد بن محمد المروزی نام کے جو دو شخص کتب رجال میں ملتے ہیں، ان کے شیوخ میں علی بن حسین بن واقد کا نام آتا ہے نہ ان کے تلامذہ میں ابوداؤد کا نام ہے نہ ذکر ہے۔

Marfat.com

تو اب صاف پتہ مل گیا کہ ابوداؤد اور بخاری دونوں کی روایتوں کا اصل منبع اور ٹکسال خراسان ہی ہے۔ پہلی روایت یعنی بخاری والی پورے حزم و احتیاط سے نہ بن سکی، اس لئے اس میں کسی قدر رکاکت رہ گئی، جسکو متن حدیث کی تنقید ہی میں ابھی بیان کرتا ہوں۔ اسلئے جب حلقہ وضّاعین نے اس کمزوری کو محسوس کیا تو جھٹ دوسری روایت وضع کرڈالی اور وہ رکاکت نکال دی۔ بخاری والی روایت ورقار کے ذریعے خراسان سے کوفہ پہنچی تھی، اور پھر کوفے سے بذریعہ محمد بن یوسف فیساریہ ساحل شام تک پہنچی اور پھر امام بخاری کو مل گئی یا انکی کتاب میں داخل کردی گئی۔ ایسی رکیک حدیث، محض ابن عباس کا ایک قول ایسے کمزور ذرائع سے امام بخاری خود اپنی کتاب میں داخل کرلیتے اور اسی کے لئے ایسے الفاظ میں باب باندھتے جو قرآن کی نص صریح کے خلاف ہو اور اس کے لئے کوئی قوی یا ضعیف ہی حدیث نبویؐ بھی ان کو نہ مل رہی ہو، ہرگز امام بخاری سے اسکی توقع نہیں کی جاسکتی اسلئے یقیناً یہ باب ہی معہ حدیث بخاری میں داخل کردیا گیا ہے۔

رکاکت معنوی امام بخاری کی روایت اور اس کا ترجمہ پڑھ جائیے۔ حضرت ابن عباس کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ "مال پہلے ولد (بیٹے) کے لئے ہوا کرتا تھا اور وصیت والدین کے لئے" غور کیجئے کیا اس سے کتب علیکم اذا حضر احدکم الموت ان ترک خیرا ن الوصیۃ للوالدین والاقربین کے حکم وصیت کی تعمیل کا رواج عہد نبوی میں جو ہوا، وہ مراد ہو سکتا ہے؟ اس آیت میں تو وراثتِ ولد کا کہیں ذکر ہی نہیں ہے۔ ابن عباسؓ کے قول میں صرف ولد کا ذکر ہے جس میں بیٹی کو بھی داخل سمجھا جاسکتا ہے اور صرف بیٹا بھی مراد لیا جاسکتا ہے۔ قرآن کی اس آیت میں صرف والدین ہی کے لئے وصیت نہیں ہے۔ بلکہ اقربین کے لئے بھی وصیت کا حکم ہے اور الاقربین میں اولاد بدرجۂ اولےٰ داخل ہیں۔ ابن عباسؓ کے اس قول میں صرف والدین ہی کے لئے وصیت کا دستور بیان کیا گیا ہے۔ اگر واقعی یہ قول ابن عباسؓ کا ہے تو اس سے زمانۂ جاہلیت کے رواج کا بیان سمجھا جاسکتا ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں بیٹی کے لئے وراثت نہ تھی نہ وصیت۔ وراثت صرف بیٹے کا حق تھا اور مرنے والا والدین کے لئے کچھ وصیت کرجاتا تھا۔ ممکن ہے کہ ابن عباسؓ نے زمانۂ جاہلیت کے اس رواج کا ذکر کرکے فرمایا ہو کہ "وراثت بیٹے کا حق تھا اور وصیت والدین کے لئے کی جاتی تھی۔ تو اللہ نے اس میں سے جو مناسب سمجھا اسکو منسوخ کردیا۔ اس کے بعد بخاری ابن عباس کا قول یوں لکھتے ہیں "تو اولاد میں سے ایک مرد کے لئے دو عورت کا حصہ رکھا اور باپ ماں ہر ایک کے لئے ایک چھٹا حصہ اور بیوی کے لئے آٹھواں اور چوتھائی اور شوہر کے لئے نصف اور چوتھائی"

مگر پھر حضرت ابن عباس یہاں بھولے۔ بیوی اور شوہر کے لئے دونوں حالتوں میں اولاد ہو جب اور اولاد نہ ہو جب کیا ملے، تصریح کے ساتھ بیان کیا۔ مگر والدین کے متعلق صرف ایک ہی صورت میں

Marfat.com

اولاد ہو تو کیا ملے۔ اسی کو بیان کیا اور اگر میت لاولد ہو تو ماں باپ کو کتنا کتنا ملے، اس کا ذکر بھول گئے۔ اور اگر میّت کے بھائی بہن بھی ہوں جب ماں باپ کو کتنا کتنا ملے، اس کی بھی تصریح نہ کی۔ جب کہ بیوی اور شوہر کے حصّوں میں جو جو فرق اولاد کے ہونے یا نہ ہونے اور بھائی بہن کے ہونے یا نہ ہونے کے سبب سے پیدا ہوتے ہیں، ان کو بھی تو ضرور مذکور ہونا تھا، ورنہ جس طرح ابوداؤد والی روایت میں تصریح حصص کو چھوڑ دیا ہے اس روایت میں بھی تصریح حصص نہ ہوتی۔ غرض بیان رواج سابق اور حصّوں کی تصریح کرکے اس روایت کی متن کو رکاکتوں سے بھر دیا ہے۔ جو ہرگز ہرگز حضرت ابن عباس کا قول نہیں ہو سکتا۔ اس لئے یقیناً یہ روایت صحیح بخاری میں داخل کردی گئی ہے، امام بخاری نے کبھی نہیں لکھی ہوگی۔

مختصر یہ کہ حضرت ابن عباسؓ کی طرف منسوب یہ دونوں قول خراسانیوں کے من گھڑت ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں۔

اصل حدیث

اب لا وصیۃ لوارثٍ والی حدیث کے عُروق روایت کو ملاحظہ فرمائیے۔ یہ حدیث تین صحابیوں سے روایت کی گئی ہے۔ عمرو بن حارجہ۔ ابوامامۃ الباہلی اور انس بن مالک

سلسلۂ اسناد

۱؎ قتادہ۔ شہر بن حوشب الشامی۔ عبدالرحمٰن بن غنم۔ عمرو بن خارجہ۔

۲؎ ہشام بن عمار۔ اسمٰعیل بن عیاش۔ شرجیل بن مسلم الخولانی۔ ابوامامۃ الباہلی

۳؎ ہشام بن عمار۔ محمد بن شعیب بن شابور۔ عبدالرحمٰن بن یزید بن جابر۔ سعید بن ابی سعید۔ انس بن مالک۔

پہلی روایت کو ابن ماجہ ابوبکر بن شیبہ سے وہ یزید بن ہارون سے وہ کید بن ابی عروہ اور دوسرے سے روایت کرتے ہیں۔ اور ترمذی و نسائی قتیبہ بن سعید سے وہ ابوعوانہ سے وہ قتادہ سے اور نسائی اسمٰعیل بن مسعود سے بھی اور وہ شعبہ سے وہ قتادہ سے۔ مگر ان تمام روایتوں میں قتادہ، شہر بن حوشب سے وہ عبدالرحمٰن بن غنم سے وہ عمرو بن خارجہ سے روایت کرتے ہیں۔ لیکن نسائی کی ایک آخری روایت میں جو نسائی قتیبہ بن عبداللہ المروزی سے وہ عبداللہ بن المبارک سے وہ اسمٰعیل بن ابی خالد سے اور وہ قتادہ سے روایت کرتے ہیں۔ اس میں قتادہ بلاواسطہ کسی کے عمرو بن خارجہ سے روایت کر رہے ہیں، جو یقیناً خلاف اصل ہے۔ اس میں شہر بن حوشب اور عبدالرحمٰن بن غنم کے دو واسطے چھوٹے ہوئے ہیں۔ قتادہ غریب نے عمرو بن خارجہ صحابی کی صورت بھی نہ دیکھی ہوگی۔

تو یہ روایت دراصل شہر بن حوشب سے ہے۔ جو شامی ہیں اور بیت المال کے خازن تھے۔ روپے کی ایک تھیلی چرائی تھی، جس پر اُس وقت کے ایک شاعر نے ان کی شان میں کچھ اشعار کہے تھے، جس کا

Marfat.com

ایک شعر یہ ہے:-

؎ لقد باع شهرٌ دینه بخریطة
فمن یأمن القراء بعدك یا شهرُ

یعنی "شہر" نے اپنا دین ایک تھیلی پر بیچ ڈالا۔ تو پھر تیرے بعد اے شہر قاریوں پر کون بھروسا کرے؟

شہر نے ۱۱۲ھ میں وفات پائی۔ ائمہ رجال اس سے انکار کرتے ہیں کہ انھوں نے کوئی حدیث عبدالرحمٰن بن غنم سے سُنی ہو۔ شعبہ اور محدثین کی ایک جماعت نے شہر بن حوشب کو ضعیف اور متروک الحدیث قرار دیا ہے اور ابن حزم نے ساقط عن الاعتبار لکھا ہے۔ عیاد بن منصور کا بیان ہے کہ میرے ساتھ یہ حج کو گئے تھے تو راہ میں میرا عیبہ (سوٹ کیس) چرا لیا۔ یہ شہر صاحب اسمار بنت یزید بن السکن کے غلام آزاد کردہ تھے۔ غرض انھیں کی روایت سے یہ حضرت عمرو بن خارجہ کیطرف منسوب حدیث ابن ماجہ نسائی اور ترمذی میں ہے۔ ان کے سوا کوئی اس حدیث کو روایت نہیں کرتا۔

ابوامامہ والی حدیث

یہ حدیث صرف اسمٰعیل بن عیاش الحمصی سے ابن ماجہ، ابوداؤد اور ترمذی روایت کرتے ہیں۔ ابن ماجہ، ہشام بن عمار سے وہ اسمٰعیل بن عیاش سے اور ابوداؤد عبدالوہاب بن نجدہ سے۔ وہ اسمٰعیل بن عیاش سے اور ترمذی ہناد اور علی بن حجر سے اور یہ دونوں اسمٰعیل بن عیاش سے اور اسمٰعیل بن عیاش شرجیل بن مسلم الخولانی سے وہ حضرت ابوامامۃ الباہلی سے جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا۔

اسمٰعیل بن عیاش شامی ہیں۔ حمص کے رہنے والے ہیں۔ صحیح مسلم کے مقدمہ میں امام مسلم لکھتے ہیں:- بقیہ بن الولید جو روایت مشہور و معروف لوگوں سے کریں، اس کو لکھ لینا چاہئے اور جو روایت غیر معروف مجہول لوگوں سے کریں انہیں لکھنا چاہئے۔ مگر اسمٰعیل بن عیاش چاہے مشہور و معروف لوگوں سے روایت کریں چاہے مجہول راویوں سے انکی کسی قسم کی بھی حدیث ہرگز نہیں لکھنا چاہئے اور عقیلی نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ یہ شخص ایسا ہے کہ کچھ سمجھتا ہی نہیں کہ اس کے دماغ سے کیا نکل رہا ہے۔ ابن خزیمہ نے کہا کہ اس کی حدیثوں سے احتجاج کرنا ہی نہیں چاہئے اور عبداللہ بن المبارک کا قول ہے کہ ان کی حدیث کی روایت جائز نہیں۔ منوی نے بھی ان کا ذکر ان لوگوں میں کیا ہے، جن کی روایتوں کی طرف سے منہ پھیر لینا چاہئے۔ ۱۸۱ھ میں وفات پائی۔ بس اسی اسمٰعیل بن عیاش سے حضرت ابوامامۃ الباہلی کی طرف منسوب روایت کا دارومدار ہے۔

حضرت انس والی حدیث

یہ روایت ابوداؤد اور ترمذی میں نہیں ہے۔ صرف ابن ماجہ میں ہے۔ ابن ماجہ ہشام بن عمار سے بذریعہ اسمٰعیل بن عیاش، ابوامامۃ الباہلی والی حدیث روایت کرتے ہیں اور پھر ہشام بن عمار ہی سے بذریعہ محمد بن شعیب بن شابور اور وہ عبدالرحمٰن بن یزید بن جابر سے وہ بن ابی سعید سے وہ حضرت انس بن مالک سے روایت کرتے ہیں۔

Marfat.com

ہشام بن عمار بن الدمشقی۔ یہ ایسی چار سو حدیثیں روایت کیا کرتے تھے، جنکی کوئی اصل نہ تھی بعض لوگ ان کو اِدھر اُدھر سے حدیثیں لا لاکر دیتے تھے اور یہ ان کو روایت کیا کرتے تھے۔ بعض محدثین نے ہشام بن عمار سے کہا کہ تم اسلام میں ضرور کوئی فتنہ پیدا کروگے تو ہشام نے کہا کہ میری حدیثیں مروج ہوچکیں۔ مجھ کو اس کی پروا نہیں کہ اُنکی غلطیاں کس کے سر پڑیں گی۔ امام احمد بن حنبل فرماتے تھے کہ جس نے ہشام بن عمار کے پیچھے نماز پڑھی ہو، اس کو چاہئے کہ اپنی نماز دوبارہ پڑھ لے۔ ہشام ۱۵۳ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۴۵ھ میں دمشق ہی میں دنیا سے سدھارے۔

اور محمد بن شعیب بن شابور بھی دمشقی ہی تھے۔ بنی امیہ کے آزاد کردہ غلاموں میں سے مرجیہ تھے ۱۹۰ھ میں وفات پائی۔

اور عبدالرحمن بن یزید بن جابر انوردی۔ یہ بھی شامی ہیں۔ ۱۵۴ھ میں بقول اصح وفات پائی ضعیف الحدیث تھے اہل کوفہ سے منکر حدیثیں بہت روایت کیں۔

باقی رہ گئے سعید بن ابی سعید۔ ان کے متعلق بعد محدثین کا خیال ہے کہ یہ مقبری ہیں، جو مدینہ طیبہ کے ایک مقبرہ کے مجاور تھے۔ جن کے باپ قبیلہ بنی لیث کی ایک عورت کے مکاتب غلام تھے۔ ۱۲۳ھ میں جنھوں نے وفات پائی اور وفات سے چار سال پہلے مخبوط الحواس ہوگئے تھے۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ حدیث سعید بن ابی سعید المقبری سے مروی ہی نہیں ہے۔ اس حدیث کے سلسلہ روایت میں چاہے وہ کسی صحابی سے روایت کی گئی ہو ایک بھی حجازی راوی نہیں ہے، بجز خراسانیوں اور شامیوں کے۔ جس کی دلیل واضح یہ ہے کہ یہ حدیث جو ابن ماجہ میں مروی ہے تو سعید بن ابی سعید کے نام کے ساتھ لفظ نہیں ہے۔ (دوسرا طریق) دارقطنی روایت کرتے ہیں ابوبکر نیشاپوری سے وہ عباس بن [illegible] اپنے والد (ولید بن فرید) سے۔ وہ عبدالرحمن بن یزید بن جابر سے۔ انھوں نے کہا کہ مجھ سے حدیث بیان کی سعید بن ابی سعید ایک ساحلی شیخ نے انھوں نے کہا کہ مجھ سے حدیث بیان کی ایک شخص[1] نے اہل مدینہ میں سے۔ اس کے بعد حدیث مذکور ہے۔

اس روایت میں واضح کردیا گیا ہے کہ سعید بن ابی سعید کے متعلق کہ "شیخ بالساحل" اور ساحل شام کے رہنے والے سعید بن ابی سعید مشہور راوی ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ یہ ساحل شام والے سعید بن ابی سعید از بیدی پر کذب کا الزام ہے اور ان کی روایتیں معتبر نہیں ہیں۔ جھوٹی حدیثیں بہت گھڑا کرتے تھے۔ لے دے کے طبری کی روایت بعض محدثین پیش کرتے ہیں جس میں سعید بن ابی سعید بعد "المقبری" کا لفظ صراحۃً موجود ہے۔ مگر یہ خیال نہیں کرتے کہ

---

[1] یعنی حضرت انس بن مالک۔ نام کیوں چھپایا؟ یا کیوں بھول گئے؟ اسکو نہ پوچھئے، یہ بھی ایک شان ہے جھوٹی حدیثیں روایت کرنے والوں کی۔

طبرانی نے اس حدیث کو مسند الشامیین میں نقل کیا ہے اور یہ اس کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ سعید بن ابی سعید ساحل شام ہی والے ہیں نہ کہ "مقبری" مدینہ والے۔ اگر یہ مقبری مدینہ والے ہوتے تو طبرانی اسی حدیث کو مسند اہل المدینہ میں درج کرتے۔ نہ کہ مسند الشامیین میں۔ صحابہؓ سے جو شخص روایت کر رہا ہو، اس کی سکونت کا ایسے موقع پر اعتبار کیا جاتا ہے۔ ورنہ تابعی کے بعد تو تبع تابعی یا تبع تبع تابعی مختلف مختلف سکونت کے ہو سکتے ہیں۔ اسلئے مسند الشامیین میں صرف شامی تابعی کا اعتبار کیا جائے گا کہ نہ تابعی کے بعد والوں کا۔ یقیناً کسی کاتب نے طبرانی کے نسخے میں یہ تصحیف اپنی طرف سے کر دی ہوگی۔ طبرانی نے جب اس حدیث کو مسند الشامیین میں درج کیا ہے تو یقیناً ان کی مراد وہی سعید بن ابی سعید ساحلِ شام والے ہی ہیں۔

خلاصہ تنقید رجال

تو صاف معلوم ہو گیا کہ حضرت انس بن مالک کی طرف منسوب حدیث اسی ساحل شام والے سعید بن ابی سعید کذاب کی من گھڑت ہے۔ اور حضرت عمرو خارجہ کی طرف منسوب حدیث شہر بن حوشب شامی مشہور چور غیر معتبر شخص کی نمک زادہ ہے۔ اور حضرت ابو امامۃ الباہلی کی طرف منسوب حدیث اسماعیل بن عیاش الحمصی الشامی کی گھڑی ہوئی ہے۔ اور ان سب حدیثوں کی ٹکسال چاہے خراسان ہو یا کوفہ مگر اشاعت گاہ شام ہی رہی۔

تنقید متن حدیث

حضرت ابو امامہ والی حدیث مختصر ہے حدثنا شرحبیل بن مسلم الخولانی سمعت ابا امامۃ الباھلی یقول سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول فی خطبتہ عام حجۃ الوداع ان اللہ قد اعطی کل ذی حق حقہ فلا وصیۃ لوارث یعنی شرحبیل بن مسلم الخولانی نے کہا کہ میں نے ابو امامۃ الباہلی سے سنا کہ وہ کہتے تھے کہ میں نے سنا رسول اللہ صلعم سے کہ آپ حجۃ الوداع کے سال اپنے خطبے میں فرما رہے تھے کہ بیشک اللہ نے ہر حق والے کو اس کا حق دے دیا ہے تو کسی وارث کے لئے وصیت نہیں رہی۔ بظاہر یہ حدیث بہت صاف گھڑی گئی ہے۔ مگر پھر بھی کمزوریاں موجود ہیں۔ "حجۃ الوداع کا خطبہ" نہیں کہا۔ بلکہ "حجۃ الوداع کے سال اپنے خطبے میں فرمایا" جس سے پورے سال کے تمام خطبوں کو شامل۔ ورنہ حجۃ الوداع میں تو تقریباً ایک لاکھ صحابہ تھے۔ پھر بصیغہ واحد متکلم حضرت ابو امامہ ہی نے کیوں سنا؟ اگرچہ کوئی خطبہ بھی ہو سننے والے متعدد ہی ہوں گے۔ اس لئے یہ صیغہ واحد متکلم کسی حال میں بھی صحیح نہیں ہو سکتا۔ اور عرب ایسے جاہل نہ تھے کہ واحد متکلم اور جمع متکلم کا محل استعمال نہ جانتے ہوں یہ عجمی راویوں سے ہو سکتا ہے۔ حضرت عمرو بن خارجہ کے متعلق کہا گیا ہے کہ انھوں نے فرمایا۔ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم خطبھم وھو علی راحلتہ وان راحلۃ لتقصع لجرتھا وان لعابھا یسیل بین کتفی۔ قال ان اللہ قد اعطی کل وارث نصیبتہ من المیراث فلا یجوز لوارث وصیۃ۔ الولد للفراش وللعاھر الحجر۔ ومن ادعی الی غیر ابیہ او تولی غیر موالیہ فعلیہ لعنتہ اللہ والملٰئکۃ والناس اجمعین لا یقبل منہ صرف ولا عدل۔ امتال

(ابن ماجہ) یعنی عمرو بن حارجہ نے کہا کہ رسول اللہ صلعم لوگوں کو خطبہ دے رہے تھے اور آپ اپنی سواری (اونٹنی) پر تھے اور وہ اونٹنی جگالی کئے جارہی تھی اور اس کا لعاب میرے دونوں مونڈھوں کے درمیان بہ رہا تھا تو رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ بے شک اللہ نے تقسیم کردیا۔ ہر وارث کے لئے اس کا حصہ میراث میں سے تو نہیں جائز ہے کسی وارث کے لئے وصیت اور لڑکا فراش (منکوحہ بیوی) کے لئے ہے زناکار کے لئے پتھر ہے اور جو شخص اپنے باپ کے سوا کسی اور کی اولاد ہونے کا دعویٰ کرے یا اپنے مولا کے سوا کسی اور کا مولا بنے تو اس پر اللہ کی، فرشتوں کی اور تمام انسانوں کی لعنت ہے۔ نہیں قبول کی جائے گی اس سے توبہ اور نہ فدیہ۔ راوی اپنا شبہ ظاہر کرتا ہے کہ آپ نے پہلے صرفؓ فرمایا یا پہلے عدلؓ فرمایا۔ یہ بھی ایک طریقہ ہے روایت کو سچی ثابت کرنے کا ایک آدھ لفظ میں شبہ ظاہر کردیا کہ یوں کہا یا یوں کہا۔ تاکہ معلوم ہو کہ کتنا دیانت دار راوی ہے کہ جہاں اسکو شبہ ہوا اس شبہ کو بھی اس نے ظاہر کردیا باقی الفاظ تو ضرور وہی ہیں جو رسول اللہ صلعم کی زبان مبارک سے نکلے۔ راوی کو کسی اور لفظ میں کوئی شبہ نہ ہوا۔ پھر اونٹنی کی کیفیت یہ بیان کرنا کہ وہ جگالی کئے جارہی تھی اور اس کے منہ سے لعاب جاری تھا اور راوی سننے میں اسقدر مستغرق تھا کہ لعاب اس کے دونوں مونڈھوں کے درمیان بہہ رہا تھا مگر یہ اسکی مطلق پروا نہیں کررہا تھا۔ راوی نے اپنی بے خبری کو بھی ظاہر نہیں کیا ہے۔ جس سے ظاہر ہے کہ راوی محسوس کررہا تھا کہ اس پر لعاب گر رہا ہے مگر خطبہ سننے کے خیال سے اس نے کپڑے خراب ہونے کی بالکل پرواہ نہیں کی۔ اور اُس سے قرب بھی ظاہر ہوگیا کہ وہ کس قدر قریب سے سُن رہا تھا۔ حدثیں گھڑنے والے نفسیات کے بڑے ماہر ہوتے ہیں۔ اسلئے خوب غور وخوض کرکے حدیث کے الفاظ باہمی مشورے سے چُنتے تھے اور عنوان بیان بہت مناسب اختیار کرتے تھے۔

مگر ترمذی کی روایت میں الفاظ کا فرق اور مضمون کا اختصار ہے اس میں ہے ان النبی صلعم خطب علی ناقته وانا تحت جرابها دهی تفصع بجرتها وانّ لعابها لیسیل بین کتفی فسمعته یقول ان الله عزوجل اعطی کل ذی حق حقه فلا وصیّة لوارث والولد للفراش وللعاهر الحجر اور نسائی میں اور بھی اختصار ہے۔ یہ لکھتے ہیں کہ ابن خارجہ نے کہا کہ انا شهد رسول الله صلعم یخطب الناس علی راحلته وانها لتفصع بجرتها وان لعابها لیسیل فقال رسول الله صلعم فی خطبة ان الله قد قسّم لکل انسان قسمة من المیراث فلا یجوز لوارث وصیّة۔

مگر نسائی میں دو طریق اور بھی ہیں اور نہایت مختصر ہیں ایک میں ہے کہ عمرو بن خارجہ نے کہا کہ خطب رسول الله صلعم فقال ان الله اعطی کل ذی حق حقه ولا وصیة لوارث اور آخری طریق ہے کہ قال رسول الله صلعم ان الله عزاسمه قد اعطی کل ذی حق حقه ولا وصیة لوارث یعنی اس میں اللہ تعالےٰ کے نام کے بعد عزاسمہٗ کا اضافہ ہے ورنہ یہ دونوں آخری طریق ایک ہی ہیں۔ لیکن پہلے طریق میں صرف لعاب کے بہنے کا ذکر ہے

Marfat.com

مگران کے مونڈھے پر لعاب کے گرنے کا ذکر نہیں ہے۔ مگران تمام طویل ومختصر روایتوں کے راوی وہی قتادہ وہی شہر بن حوشب وہی عبدالرحمٰن بن غنم وہی عمرو بن خارجہ ہیں۔ مگر صرف "صَحُوْتُ ولا عَدلتُ" میں جو ابن ماجہ والی روایت میں راوی صاحب کو شبہ ہوا ہے تو اس کو ظاہر کر دیا۔ مگران روایتوں میں جو کہیں ان اللہ قسّم لکل وارث نصیبہ من المیراث ہے، کہیں قسّم لکل انسان قسمتہٗ من المیراث ہے۔ کہیں ان اللہ اعطے کل ذی حق حقہ ہے کہیں ان اللہ عزوجل اعطے ہے مگران اختلافات کو بلا اظہار اشتباہ قتادہ صاحب نے کسی سے کچھ کسی سے کچھ بیان کر دیا۔ اصل یہ ہے کہ اگرچہ حدیث گھڑی ہوئی تو شہر بن حوشب ہی کی ہے مگران سے روایت کرتے ہیں قتادہ جو مشہور مدلس ہیں اور ہر طرح کی رطب و یابس حدیث روایت کرنے کے خوگر ہیں اور فرد کے بڑے امام تھے اپنے مسلک کی لوگوں کو دعوت دیا کرتے تھے۔ مرسل حدیثیں بہت روایت کیا کرتے تھے۔ محدثین ان کی مرسلت کو بمنزلۃ الریح سمجھتے تھے۔

حضرت انس والی روایت

جو صرف ابن ماجہ میں ہے یا دارقطنی میں یا طبرانی کی سند اشامعین میں ابن ماجہ اور طبرانی کے اسناد بالکل ایک ہی ہیں۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ ابن ماجہ بلا واسطہ ہشام بن عمار سے روایت کرتے ہیں اور طبرانی بواسطۂ احمد بن انس بن مالک جو ایک مجہول الحال راوی ہیں۔ البتہ دارقطنی کے ابتدائی تین راوی اوروں سے مختلف ہیں۔ یعنی دارقطنی روایت کرتے ہیں عبداللہ بن محمد بن عبدالعزیز سے وہ داؤد بن رشید سے وہ عمرو بن عبدالواحد سے اور وہ عبدالرحمان بن یزید بن جابر سے وہ سعید بن ابی سعید سے وہ حضرت انس سے۔ اور دوسرے طریق میں دارقطنی روایت کرتے ہیں ابوبکر نیشاپوری سے وہ عباس بن ولید بن یزید سے وہ اپنے باپ ولید بن یزید سے وہ عبدالرحمن بن یزید بن جابر سے وہ سعید بن ابی سعید شیخ ساحلی سے وہ اہل مدینہ میں سے ایک شخص سے یعنی انس بن مالک سے۔ ابن ماجہ کی حدیث یوں ہے کہ عن انس بن مالک قال ان لتحت ناقتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیسیل علیّ لعابھا فسمعتہ یقول ان اللہ قد اعطے کل ذی حق حقہ الا لا وصیۃ لوارث اور دارقطنی کی روایت یوں ہے عن انس بن مالک قال انی لتحت ناقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یسیل علیّ لعابھا فسمعتہ یقول ان اللہ عزوجل قد اعطے کل ذی حق حقہ فلا وصیۃ لوارث۔ والولد للفراش وللعاھر الحجر۔ لا یُدعیٰ رجلٌ الی غیر ابیہ ولا ینتمی الے غیر موالیہ فمن فعل ذلک فعلیہ لعنۃ اللہ متتابعۃ ولا تنفق المرأۃ من بیت زوجھا الا باذنہ فقال رجل ولا الطعام؟ یا رسول اللہ قال ذلک افضل اموالنا۔ ثم قال الا ان العاریۃ مؤدّاۃ والدین مقضیّ والزعیم غارم۔

دارقطنی کا دوسرا طریق بھی اسی طرح کا ہے۔ اور طبرانی کا طریق بھی اسی طرح ہے اب ترجمہ سنئے

Marfat.com

فرماتے ہیں :۔ میں رسول اللہ صلعم کی اونٹنی کے نیچے تھا اور اس کا لعاب مجھ پر بہہ رہا تھا تو میں نے آپ کو سُنا کہ آپ فرما رہے تھے کہ بے شک اللہ عزّوجل نے دیدیا ہر حق والے کو اس کا حق تو وصیت نہیں ہے کسی وارث کے لئے۔ اور لڑکا فراش (منکوحہ) کے لئے ہے اور زناکار کے لئے پتھر ہے۔ ہرگز نہ پکارا جائے کوئی شخص اپنے باپ کے سوا کسی اور کی طرف منسوب کرکے اور نہ منسوب ہو کوئی اپنے موالی کے سوا کسی اور کی طرف۔ جس نے ایسا کیا تو اُس پر اللہ کی پے درپے لعنت ہے۔ نہ خیرات کرے کوئی عورت اپنے شوہر کے گھر سے اس کی اجازت کے بغیر۔ تو کہا ایک شخص نے اور کھانا بھی نہیں یا رسول اللہ! آپ نے فرمایا یہ افضل ہے ہم لوگوں کے اموال سے۔ پھر فرمایا۔ عاریت ادا کی جانے والی چیز۔ اور قرض ادا کیا جانیوالا ہے اور کفالت کرنے والا ضامن ہوتا ہے۔

یہ ترجمہ دارقطنی کی حدیث کا پیش کیا گیا۔ چونکہ آخر کے مضامین اس میں فاضل ہیں جو ابن ماجہ کی روایت میں نہیں ہیں اور دارقطنی کے دوسرے طریق میں نحوہ لکھا ہے یعنی اس طرح طبرانی کی روایت کو بھی حاشیہ دارقطنی میں نحوہ کرکے لکھا ہے اس لئے ترجمہ اسی کا پیش کیا۔

اونٹنی کا لعاب

بہرحال حضرت انس کی طرف منسوب روایت جہاں بھی ہے مختصر یا طول سب میں اونٹنی کے نیچے ان کا ہونا اور اونٹنی کے لعاب کا ان پر بہنا مذکور ہے۔ پھر حضرت عمرو بن خارجہ والی روایت ابن ماجہ، نسائی اور ترمذی میں ہیں۔ جو مذکور ہوئیں جن میں اونٹنی کے نیچے عمرو بن خارجہ کا ہونا اور ان کے دونوں مونڈھوں کے درمیان اونٹنی کے لعاب کے بہتے رہنے کا ذکر ہے۔ اب کوئی بتائے کہ حضرت انس بن مالک اونٹنی کے نیچے کہاں پر تھے اور حضرت عمرو بن خارجہ کہاں پر تھے کہ دونوں پر اونٹنی اپنا لعاب گرا رہی تھی۔

پھر جن مضامین کا ذکر انس بن مالک کی طرف منسوب حدیث میں ہے ان میں سے آخری مضامین کا ذکر اور کسی روایت میں نہیں ہے۔ اور وہ حجۃ الوداع والے سال کا تو ذکر صرف حضرت ابو امامۃ الباہلی کی طرف منسوب حدیث میں ہے وہ بھی ابن ماجہ اور ترمذی کی روایت میں۔ ابوداؤد کی روایت میں اس کا ذکر نہیں۔

محدثین کا طریقہ تطابق محدثین بڑی آسانی سے یہ کہدیں گے کہ ایک بار حجۃ الوداع کے سال بھی کسی خطبے میں آپ نے فرمایا تھا جس کو ابو امامۃ الباہلی نے سُنا تھا۔

اور اس کی روایت کی۔ اور ایک دوسرے موقع پر انس بن مالک آں حضرتؐ کی اونٹنی کے نیچے کھڑے تھے اور ان پر اونٹنی کا لعاب گر رہا تھا۔ اور تیسرے موقعہ پر عمرو بن خارجہ اونٹنی کے پاس اس طرح کھڑے تھے کہ اونٹنی کا لعاب ان کے مونڈھوں کے درمیان گر رہا تھا اور ایسے اتفاقات امکان سے باہر نہیں ہیں۔ باقی جو مختصر مختصر روایتیں ہیں ممکن ہے کہ راوی نے کبھی مفصل بیان کیا۔ کبھی تفصیل کا موقع نہیں پایا' یا ضرورت نہیں سمجھی اس لئے اختصار سے کام لیا۔ یا یہ بھی دوسرے مختلف مواقع کے واقعات ہوں اور آپ نے اس مضمون کو بار بار بیان فرمایا ہو کہ جب اللہ تعالیٰ نے ورثہ کے حصے خود مقرر کر دئے تو اب وارث کے لئے وصیت جائز نہیں رہی۔ وغیر ذالک فی التاویلات۔

مگر یہ محدثین اس کو کیا کریں گے اور اس کا کیا جواب دیں گے کہ یہ روایتیں جو صرف تین صحابیوں کیطرف منسوب ہیں ابو امامۃ الباہلی' عمرو بن خارجہ اور انس بن مالک جن میں سے ایک بھی اکابر مہاجرین و انصار میں سے نہیں ہیں۔ انس بن مالک خادم رسول اللہ صلعم اگرچہ بہت مشہور صحابی ہیں۔ مگر ہجرت کے وقت آٹھ دس برس کے تھے۔ جیسا کہ استیعاب میں مذکور ہے۔ آنحضرت صلعم کی وفات کے وقت اسی حساب سے اٹھارہ بیس برس کے ہوں گے۔ بصرہ سے دو میل پر مقام طف میں مکان بنایا تھا۔ وہیں رہے وہیں ۹۱ھ میں وفات پائی بصرہ میں یہ آخری شخص تھے۔ جس نے آنحضرت صلعم کو دیکھا تھا۔ بلکہ ان کے بعد صرف حضرت ابو الطفیل ہی کی وفات ہے جو آخری صحابی روئے زمین پر رہ گئے تھے۔ اور ابو امامۃ الباہلی مصر میں رہتے تھے پھر حمص شام کے علاقے میں آکر رہ گئے اور یہیں وفات پائی۔ شام میں یہ سب سے آخری صحابی تھے۔ ان کے بعد کوئی صحابی شام میں نہ رہا۔ صرف شامیوں ہی نے ان کی حدیثیں روایت کی ہیں۔ اور بہت روایت کی ہیں۔ ۸۱ھ یا ۸۶ھ میں وفات پائی۔ اور عمرو بن خارجہ بن المشفق الاسدی یہ بھی شام ہی کے ساکن تھے۔ ان سے بس یہی ایک روایت لاوصیۃ لوارث والی ہے۔ جس کو ان سے عبدالرحمٰن بن غنم اور ان سے شہر بن حوشب اور ان سے قتادہ روایت کرتے ہیں اس کے سوا ان سے کوئی اور حدیث کہیں مروی نہیں نہ ابن غنم کے سوا کوئی اور ان سے کچھ روایت کرتا ہے عبدالرحمٰن بن غنم شامی ہی ہیں۔

اصل حقیقت

یہی ہے جیسا کہ میں نے اوپر لکھا کہ حضرت ابن عباس والے قول کو تو ورقار اور علی بن واقد نے خراسان میں گھڑا تھا یا ایک کو ورقار نے کوفہ میں اور دوسرے قول کو [illegible]

Marfat.com

گھڑا۔ اور لا وصیۃ لوارث والی حدیث کو سعید بن ابی سعید ساحلی شام والے کذاب نے حضرت انس کی طرف اور شہر بن حوشب شامی چور بدمعاش نے حضرت عمرو بن خارجہ کی طرف اور اسماعیل بن عیاش الحمصی الشامی کذاب نے حضرت ابوامامۃ الباہلی کی طرف منسوب کرکے شام کے علاقوں میں اور خراسان و عراق و مصر میں اس کی اشاعت کی ایسے جلیل القدر صحابہ کا نام نہ لیا کہ کوئی یہ کہہ سکے کہ آخر بھی شامیوں نے ان سے یہ حدیث کیوں سنی؟ اس لئے ان ہی صحابہ کی طرف منسوب کیا جو شام ہی میں رہے اور شام ہی میں وفات پائی یا عراق میں جیسے حضرت انس رض مگر یہ کوئی نہیں پوچھتا کہ رسول اللہ صلعم کے اس خطبے کو انھیں تین صحابیوں نے کیوں سنا؟ اکابر صحابہ اس سے کیوں بے خبر رہے؟ اگر کہا جائے کہ وہ لوگ بے خبر نہ تھے، سب باخبر تھے۔ تو پھر آخر اس کی روایت اکابر صحابہ اور تابعین حجاز کیوں نہیں کرتے؟

یہی وہ حدیث ہے جس کو متواتر اور ناسخ قرآن تک کہا جاتا ہے۔ مگر کیا اگلے محدثین اس حدیث کی تنقید اس طرح نہیں کرسکتے تھے؟ ضرور کرسکتے تھے۔ مگر تنقید تو وہ کرے جس کو کوئی شبہ ہو۔ روایت پرستی سے وہ اتنے مغلوب تھے کہ چاہے کیسی ہی حدیث، قرآن مبین کی کیسی ہی صریح آیات کے خلاف کیوں نہ ہو جائے۔ اگر ان کے کسی مرغوب مسئلے کی اس سے تائید ہو رہی ہے۔ تو پھر بلا چون وچرا اس کو مان لیں گے یہ عادت کچھ ایسی پڑی رہی کہ تنقید حدیث کے اصول خود بنانے کے باوجود انھوں نے کبھی صحیح معنوں میں تنقید حدیث کی ہی نہیں موضوعات کی کتابوں کو اٹھا کر دیکھئے کتنی صحیح حدیثوں کو موضوع قرار دے دیا اور صحاح کے اندر کتنی موضوع حدیثیں بھر لیں۔ یہ اس لئے کہ ان کا معیار صحت و غلط ہی انوکھا ہے۔ ان کا معیار قرآن و عدم مطابقت قرآن کو ایک اہم معیار ضرور لکھتے ہیں مگر کبھی اس معیار پر کسی حدیث کو پرکھتے نہیں۔ اور اگر کبھی کسی آیت کی بنا پر بظاہر کسی حدیث کو رد بھی کیا تو غلط بنیاد پر۔ درحقیقت اس آیت کی مخالفت کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے مزعومہ کسی رائے یا عقیدہ یا کسی مسئلے کی مخالفت کی بنا پر اور بظاہر کسی آیت کو ایک ٹٹی بنا لیا ہے۔ جیسے تکثر لکم الاحادیث بعدی فما روی لکم حدیث فاعرضوہ علی کتاب اللہ فما وافقہ فاقبلوہ وما خالفہ فردوہ یعنی آں حضرت نے فرمایا کہ میرے بعد حدیثوں کی بڑی کثرت ہوگی۔ تو جو حدیث تمھارے سامنے مجھ سے روایت کی جائے اس کو کتاب اللہ کے سامنے پیش کرو جو اس کے موافق ہو اس کو قبول کرو جو اس کے خلاف ہو اس کو رد کردو۔ "توضیح و بلوغ" میں علامہ نقشوانی اس حدیث پر بہت خفا ہوئے ہیں اور لکھ دیا کہ اس کو زندیقوں نے گھڑا ہے۔ کیونکہ قرآن مجید کے خلاف ہے۔ قرآن مجید میں ہے ما اٰتٰکم الرسول فخذوہ وما نھٰکم عنہ فانتھوا۔ یعنی جو کچھ تمھیں رسول نے دیا اس کو لے لو اور جس سے باز رکھا اس سے باز رہو۔

Marfat.com

حالانکہ اگر واقعی اس آیت کے تحت میں حدیث بھی آسکتی ہے تو یہ حدیث تکثر لکم الخ والی تو یہی بتا رہی ہے کہ کسی حدیث کے سننے کے بعد پہلے یہ دیکھ لو کہ وہ ما اتکم الرسول ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو ضرور قبول کرو ورنہ وہ تو ما اتکم الرسول ہے ہی نہیں۔ اس لئے ما نھٰکم عنہ میں داخل ہے۔ اس سے باز ہی رہنا فرض ہے۔ غرض قرآن سے استدلال بھی کہتے ہیں تو غلط طریقے سے

نسئال اللہ تعالیٰ ان یجعلنا ممن یطیعہ ویطیع رسولہ ویتبع رضوانہ ویجتنب سخطہ انما نحن بہ ولہ وصلے اللہ علیٰ سیدنا محمدؐ واٰلہ وصحبہ وبارك وسلم وآخر دعوٰنا ان الحمد للہ رب العلمین ؎

کرتا ہے ہر خبر پہ تمنّا! یقین کیوں
ناداں! نوید دوست فریبِ عدو نہ ہو

Marfat.com

ایک

آخری مگر سچّی بات

(وہی حق گو)

مولوی عبدالماجد دریا بادی میری انگریزی کتاب "محمدان دی قرآن" پر اپنے اخبار صدق جدید مورخہ ۱۲ر جنوری ۱۹۵۳ء میں تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"سید مقبول احمد الہ آبادی سابق ڈپٹی کلکٹر ایک زمانے میں نگار کے دست راست تھے اور فتنہ انکار حدیث میں بجا طور پر بڑی بدنامی و رسوائی حاصل کئے ہوئے تھے لیکن الحمدللہ کہ اس کے بعد ہی سنبھل گئے ..... وغیرہ وغیرہ"

میں نے جواب میں عرض کیا کہ انکار حدیث رسول کی مجال تو کسی مومن کو نہیں ہو سکتی۔ حدیث منسوب الی الرسول میں البتہ کلام ہے اور علمائے سو (انہ کان ظلوماً جھولا) کے سوا کوئی ذی عقل و علم اس سے اختلاف نہیں کر سکتا۔ ورنہ آپ مولوی عبدالشکور صاحب سے ہی دریافت کر لیجئے کہ کتنی حدیثیں متواتر یقینی گنی گئی ہیں؟ حد سے حد پانچ چھ اور وہ بھی قولی نہیں بلکہ فعلی ارکان صلوٰۃ وغیرہ میں مولانا نے فرمایا "حدیث کو قرآن کے درجہ کی چیز تو ہرگز نہیں سمجھتا ہوں لیکن قرآن کے بعد جو چیز سب سے زیادہ مستند کہی جا سکتی ہے۔ وہ یہ ہی ذخیرۂ احادیث ہے جس کے درجات و مراتب استناد کی بعد امکان بشر تنقید اور تنقیح ہو چکی ہے۔"

یہ وہی عام غلط فہمی ہے جس سے مولانا کے جیسے فلسفی اور اہل علم بھی نہیں بچے۔ خدا کا شکر ہے کہ انھوں نے اور لوگوں کی طرح اس کا جواب یہ نہیں دیا کہ پھر قرآن ہی کو آپ وحی الٰہی کہنے کا کیا حق رکھتے ہیں۔ اسلئے بحث دو تنقیح طلب مسئلوں میں رہ جاتی ہے۔

اوّل۔ قرآن کامل ہے یا ناقص۔

دوم۔ کیا یہ بشری قوت سے ممکن ہے کہ وہ دو ڈھائی سو برس کے بعد زبانی روایتوں کی صحیح تنقید کر سکے۔ جبکہ اولین سننے اور دیکھنے والوں کی دس پشتیں گزر چکی ہوں۔

Marfat.com

پہلے سوال کا جواب تو یہ ہی دیا جائے گا کہ قرآن وحی متلو ہے اور حدیث وحی غیر متلو، یعنی اس بات کو تسلیم کرتے ہوئے کہ امور غیبیہ کا کوئی علم رسول اللہ صلعم کو بغیر وحی کے نہ ہو سکتا ہے نہ ہوا ہے۔ بلکہ اوامر و نواہی میں بھی وہ تابع وحی تھے ــــ لازماً یہ نتیجہ نکلے گا کہ رسول اللہ صلعم نے بعض امور کو تو بیان کر دیا اور بعض کو چھپا ڈالا یا بھلا دیا۔ پھر کبھی اتفاقیہ اسکو اپنا قول بنا کر پیش کر دیا جس کو راوی نے سن لیا اس لئے تمام وہ باتیں جن کا ذکر میں نے مطالعہ حدیث میں کیا ہے۔ بلکہ بہت سی اور باتیں وہ سب نمائندہ وحی بھی ہیں اور وحی بھی ہیں۔ میں کچھ اپنے طرف سے اسکے جواب میں عرض کرنا نہیں چاہتا۔ اپنی ہی ہوش و خرد سے اس کا جواب لیجئے۔ یہ کیا ماجرا ہے کہ خدا بعضوں کی عقل ایسی سلب کر لیتا ہے کہ وہ دو اور دو کو چار کہنا بھول جاتے ہیں۔

دوسرا سوال محض نظری ہی نہیں بلکہ تجرباتی ہے۔ آپ اپنے ہی خاندان کے کسی مشہور بزرگ کے کسی زبانی قول کو بیان کر دیجئے۔ تصدیق کرنا تو علیحدہ رہا جو آپ سے ڈھائی سو برس پہلے گزر گیا ہے اور جو ضبط تحریر میں کبھی نہیں آیا۔ شاید آپ یہ کہیں کہ میں نے یہ بیان اپنے چچا یا باپ یا زیادہ سے زیادہ اپنے دادا سے سنا تھا اور وہ ثقہ تھے مگر اسکے پہلے۔ آگے تاریک پردہ ہے یا نہیں۔ پس کیوں کر قول منسوب الی الرسول کو ہم یقینی کہہ سکتے ہیں۔ ہم تو اسکو تصدیقی کہنے کی بھی مجال نہیں پاتے آپ میں یا آپ کے راویوں میں اگر مافوق العادۃ بشری قوتیں ہوں تو اور بات ہے پھر سوائے ہٹ دھرمی و تعصب یا کورانہ تقلید و انسان پرستی کے جذبے کے کوئی اور بنیاد اس دعوے کی ہو سکتی ہے کہ یہ وہی ذخیرہ احادیث ہے جسکے درجات مراتب استناد کی بقدر امکان بشر تنقیح و تنقید ہو چکی ہے یا للعجب"

مولوی عبدالماجد صاحب اگر خدانخواستہ وکیل ہوتے تو اپنی برادری میں ایک قہقہہ برپا کر دیتے اگر کسی مقدمے کی پیروی کرتے ہوئے وہ عدالت کو یقین دلانے کی کوشش کرتے کہ انکے موکل کا دعویٰ اگر صحیح و یقینی ہے اور اس زبانی قول پر مبنی ہے جو نوابین اودھ کے زمانے سے پہلے اسکا مورث اعلیٰ اپنے کسی مجہول یا کم سن ساتھی سے کہہ گیا تھا۔ پھر کیا یہ مقام افسوس نہیں کہ وہ خدائی عدالت میں ایسی بے تکی باتیں کہنے سے نہ شرماتے ہیں نہ جھجکتے ہیں۔

(س۔م۔ا)

مصنّف کی دو اور مشہور کتابیں جو لائبریری کے سلسلہ معارف اسلامی میں شامل ہیں:-

مظاہر قرآن:- نہ صرف تمام قرآن پاک کا صاف و شستہ و عام فہم عبارت میں ترجمہ ہے بلکہ جن مسائل پر قرآن ناطق و حاوی ہے اسکو اس طرح سلجھا کر مختلف ابواب میں رکھدیا ہے کہ ہر عامی و عالم کے لئے یکساں مفید و کافی ہی نہیں بلکہ تمام مسائل دینی و ضروریات دینی سے بالکلیہ مستغنی کردیتا ہے۔ ہر باب میں مصنّف نے حسب ضرورت اپنے مختصر نوٹ سے آیات کی توضیح و تشریحات سائنس فلسفہ تاریخ قدیم و کتب سماوی کی روشنی میں کردی ہے اور عقائد و اعمال اسلامی میں اسکا خود اپنا تبصرہ بھی ہے غرضیکہ یہ کتاب ہر مسلمان کو مومن کامل بنانے کی ضامن ہے اور ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ یہ کتاب خود بھی پڑھے۔ اپنی اولاد کو پڑھائے اور اپنے غیر مسلم دوستوں کو پڑھنے کو دے۔ اس کتاب میں وہ سیرۃ نبوی بھی شامل ہے جسکی بنیاد قرآن ہے۔ غرضیکہ یہ کتاب مطالعہ حدیث کا بے بہا بدرقہ ہے۔

محاکمہ حکمت۔ جو پہلے فلسفہ مذہب کے نام سے چھپ چکی ہے۔ اب اضافہ اور تتمہ جات کے ساتھ ڈاؤن سائز کی ضخیم جلد ہوگئی ہے۔ اس میں عقلیت یعنی حکمت و مذہب کا موازنہ ہے اور مذہب اسلام کا فیصلہ۔ یونانیوں کے متروک و مردود اصول کی جگہ یورپین فلاسفر کے نئے افکار سے متخاصم ہے۔

اسکے علاوہ ہماری مطبوعات میں انگریزی کی بھی معارف اسلامی کی سیریز ہے جسکی فہرست ہم سے طلب کیجئے۔

لائبریری کے سلیکٹ کمیٹی حیہ کرچکی ہے کہ انگریزی اردو بلکہ ہندی کی ہر ایسی کتاب شائع کی جائے جو اسلام کے خوشنما چہرے کو نمودار کردے اور اس طرح تبلیغ و اشاعت اسلام کی مددگار ہو۔ آپ بھی ہماری مدد کیجئے۔ یعنی ہماری کتابوں کو زیادہ سے زیادہ حسب استطاعت خریدئے۔ اپنے لئے بھی اور دوسروں کے لئے بھی۔ لائبریری کبھی ایسی کوئی کتاب شائع نہ کرے گی جس سے اسلام کو خفت ہو۔ البتہ ہم ان کتابوں کے چھاپنے سے باز نہ رہیں گے۔ جو اسلام کے مقابل تفرقہ سازی۔ اسلام پرستی کو کبھی فروغ نہ ہونے دے۔

عباس منزل لائبریری الہ آباد (۳)

اسرار کریمی پریس الہ آباد سے لائبریری مذکور نے چھپوا کر شائع کیا

ومن الناس من یشتری لھو الحدیث لیضل عن سبیل اللہ بغیر علم

حقیقت خرافات میں کھو گئی
یہ اُمّت رَوایات میں کھو گئی

قرآن مبین

(اقبال)

مُطالعہ حدیث

تنقید صحیح کی رُوشنی میں

اور

بعض عقائد اسلامی کے مجہول و کمزور ماخذ

از

سیّد مقبول احمد صاحب بی۔اے (مصنّف فلسفۂ مذہب)

مع

تنقید از مولٰنا حافظ اسلم صاحب جیراجپوری

ناشر

عباس منزل لائبریری ——— الہ آباد (۳)

Marfat.com